مقالاتِ شبلی

(تعلیمی)

جلد سوم

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، یوپی

87 ندلو اسماء الرجال میں
165 - شبلی انگریزی سے نابلد تھے۔

صحفاً مطهرة فيها كتب قيمة

مقالاتِ شبلی

(تعلیمی)

جلد سوم

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

تمام تعلیمی مضامین کا مجموعہ جن کو مختلف رسالوں سے یکجا کیا گیا ہے۔

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ، یو۔ پی (الھند)

سلسلۂ دارالمصنّفین نمبر: ۴۰

نام کتاب : مقالات شبلی (تعلیمی) جلد سوم

نام مصنف : مقالات شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

صفحات : ۱۷۶

ایڈیشن : ۲۰۰۹ء

مطبع : معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

ناشر : دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ (ہند)

قیمت : ۸۰/روپے

ISBN: 978-93-80104-14-0

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. BOX NO. : 19
SHIBLI ROAD, AZAMGARH - 276 001 (U.P.)
e-mail: shibli_academy@rediffmail.com
Website: www.shibliacademy.org

باهتمام

عبدالمنان ہلالی

فہرست مضامین

مقالاتِ شبلی جلد سوم (تعلیمی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم

''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' میرے مضمون کا عنوان ہے، یہ ایک ایسا وسیع مضمون ہے کہ اگر اس کے ذیل میں مسلمانوں کے تمام علمی کارنامے بیان کیے جائیں تو شاید ناموزوں نہ ہو لیکن میں نے اپنے مضمون کے لیے ان میں سے صرف دو بحثیں انتخاب کی ہیں: (۱) مسلمانوں نے علوم وفنون کس طرح حاصل کیے۔ (۲) دنیا کی تمام قوموں کو ان علوم کی کیوں کر تعلیم دی، غالباً تعلیم کے خاص لفظ سے جو اس مضمون کا اصلی عنوان ہے، یہی دو بحثیں قوی تعلق رکھتی ہیں۔

مسلمانوں نے جن علوم کی اشاعت کی ان میں سے کچھ ان کے ذاتی علوم ہیں جو خود انھوں نے ایجاد کیے یا خاص طرح پر ان کو ترتیب دیا، کچھ ایسے ہیں جو دوسری قوموں سے حاصل کیے اور پھر ایسی ترقی دی کہ گویا انھیں کے ایجادات سے ہیں، میرا مضمون گو ان دونوں قسم کے علوم سے تعلق رکھتا ہے لیکن علوم کی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ ان کی طرز تعلیم کے اعتبار سے۔

میں افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ ان دو بحثوں کی

تفصیل کے لیے جس قسم کے ضروری حالات درکار ہیں یعنی فلسفۂ یونانی وغیرہ کے ترجمے، مترجموں اور تصنیفات کے نام، اسلامی دارالعلوم اور مدرسوں کی تفصیل، طریقۂ درس، نصابِ تعلیم، غرض اس قسم کے حالات مجھ کو کسی مستقل تصنیف میں نہیں ملے اور شاید لکھے بھی نہیں گیے، کشف الظنون (۱) جیسی بڑی فہرست میں صرف ایک کتاب کا نام ملتا ہے لیکن غالبًا خود کشف الظنون کے مصنف کو بھی اس کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا، چند اجمالی حالات جوگبن کی رومن امپائر وہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنرمی لوئیس و اقوام المسالک وچیمبرس انسائیکلو پیڈیا و برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا وغیرہ میں ملتے ہیں، وہ اس غرض کے لیے بے شبہ مفید ہیں کہ جب مسلمانوں کی پچھلی ترقی کے عام ذکر میں کسی پرجوش خطیب کی زبان سے ادا ہوں تو متاثر دلوں کو ہلادیں لیکن ان سے ایک مفصل تاریخی آرٹیکل کیوں کر مرتب ہوسکتا ہے، میں نے مختلف تاریخوں اور دوسری قسم کی تصنیفوں کے جستہ جستہ مقامات سے کچھ حالات بہم پہنچائے ہیں اور غالبًا یہ پہلی تحریر ہے جس میں اس قدر واقعات جمع کیے گیے ہیں، اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے میں ایک اجمالی طریقے پر مسلمانوں کے خاص علوم، ان کی ابتدائی تاریخ اور سببِ ایجاد کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

اسلام سے پہلے گو عرب کی قومیں رسمی علوم وفنون سے بالکل بے بہرہ تھیں تاہم ان خانہ بدوش صحرائیوں میں علمی مذاق کی جان پائی جاتی تھی، نظم ونثر ان کا مایۂ خمیر تھا لیکن وہ طوطی وبلبل کی طرح محض نیچرل فصیح اللسان نہ تھے بلکہ فصاحت و بلاغت کے دقیق نکتوں تک ان کی نگاہ پہنچتی تھی، بازار عکاظ کے پرجوش مشاعرے اور ان کے باہمی مباحثے اور نکتہ چینیاں بتاتی ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے تھے جانتے تھے کہ کیا کہتے ہیں اور کیا کہنا چاہیے، امرأالقیس اور علقمۃ الفحل کی شاعرانہ نزاع کا ایک عام عورت نے

(۱) یہ ایک نہایت ضخیم کتاب کئی جلدوں میں ہے، جس میں قریبًا پچاس ہزار اسلامی تصنیفوں کے نام اور ان کے حالات ہیں، چھ ضخیم جلدوں میں بمقام لندن ۱۸۴۸ء میں چھاپی گئی ہے۔

جس خوبی سے فیصلہ کیا آج فن انشا کے بڑے ماہر بھی اس سے عمدہ ریمارک نہیں کر سکتے، اس کے سوانسب کے فخر اور رشتہ وقرابت کی پابندیوں کی وجہ سے اہلِ عرب اگلے کارناموں کو ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے۔

اسلام نے آکر مذہب و معاشرت کے ساتھ ان کی علمی زندگی بھی بالکل بدل دی، قرآن مجید کی پر تاثیر آیتوں نے شعرا اور خطیبوں کی زبانیں بند کر دیں اور چونکہ دوستانہ یا مخالفانہ سرگرمی نے تمام عرب کی دماغی قوتوں کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیا تھا، پچھلے قصے تھوڑے دنوں کے لیے بھلا دیئے گیے اور علم الانساب وایام العرب کا زور بھی گھٹ گیا لیکن اسلام نے جس قدر چھینا اس سے بہت زیادہ عطا کیا، قرآن کی برابری کرنے کے حوصلے بہت جلد پست ہو گیے، اب شعرا اور خطیبوں کے لیے قرآن خود رہنما بنا اور فصاحت و بلاغت کے متعلق بہت سے نئے اصول سکھا دیئے، زبان نہایت شستہ اور صاف ہوگئی اور اونٹ بکری کے قصوں کے علاوہ شعرا کو اخلاق اور تربیت کے بہت سے مضامین ہاتھ آگئے، یہی وجہ ہے کہ حسان، حطیہ، ذوالرمہ، جریر، فرزدق، احوص کے کلام میں جو ملاحت اور برجستگی ہے شعرائے جاہلیت کے رجز وقصائد میں اس کا سراغ نہیں ملتا۔(۱)

تمام مذہبی علوم گویا اسلام کے ساتھ پیدا ہوئے، زمانۂ مابعد میں گو وہ کسی حد تک پہنچ گئے ہوں لیکن کچھ شبہ نہیں کہ ان کے ابتدائی اصول تمامتر قرآن پاک سے ماخوذ ہیں، اس کے اوامر ونواہی نے فقہ کی طرف رہبری کی، آیت توریث نے فرائض کا ایک مستقل فن قائم کیا، انبیاے سابقین کے حالات سے قصص کی ترتیب ہوئی، اعتقادات اور معاد کے متعلق آیتوں سے علم کلام استنباط کیا گیا اور گو ایک مدت تک کسی قسم کی تدوین وترتیب نہیں ہوئی لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ہی ان علوم کی ابتدائی بنیاد قائم ہوگئی اور دوسری صدی کے آغاز تک ہزاروں مسائل کا رواج ہو چکا تھا۔

---

(۱) دیکھو تاریخ ابن خلدون کا زمانہ فصل ۴۹ از فصل ۶-۱۲

قرآن مجید میں فرائض اور اعمال کا بیان اجمالی طریقے پر تھا، طریقِ عمل کی خصوصیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ عمل پر منحصر تھیں، اس ضرورت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے متعلق روایتوں کے جمع کرنے کی طرف خیال مائل ہوا اور رفتہ رفتہ علم الحدیث و اسماء الرجال وعلم الدرایہ پیدا ہو گئے، ان تحقیقات میں گو کسی قدر نکتہ چینی کی جائے مگر عموماً ہر منصف یہ فیصلہ کرے گا کہ جس بے انتہا کوشش اور تفتیش سے مسلمانوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال محفوظ رکھے، دنیا کی کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی اور یہ کہ انسانی سعی اور جستجو کی یہ آخری سرحد ہے، جہاں تک مسلمان پہنچ گئے تھے۔

علمِ نحو اگرچہ کوئی مذہبی فن نہ تھا لیکن مذہبی ہی ضرورت سے اس کی تدوین کی طرف خیال مائل ہوا، اسلام دور دراز ملکوں میں پھیلتا جاتا تھا اور سینکڑوں نئی قومیں اس میں شامل ہوتی جاتی تھیں، دوسری زبانوں کے الفاظ عربی زبان میں بہت جلد جگہ پا گئے تھے جس سے احتمال تھا کہ مشتقات اور اصولِ اعراب میں بھی فرق آ جائے، اس قسم کے تصرفات سے جو صدمہ زبان پر پڑتا اس کا بہت بڑا اثر قرآن اور حدیث پر ہوتا چند واقعات نے اس احتمال کو قوی کر دیا اور بالآخر ابوالاسود دؤلی المتوفی ۶۹ھ جس نے خود اس قسم کے تجربے حاصل کیے تھے، مسائل نحو کی تدوین کی طرف مائل ہوا، اس نے چند قاعدے منضبط کیے جو رفتہ رفتہ وسعت حاصل کرتے گئے، ہارون رشید کے زمانہ میں خلیل بن احمد بصری المتوفی ۱۷۰ھ و سیبویہ و کسائی وغیرہ کی توجہ سے وہ ایک مستقل فن بن گیا، جس کو متاخرین نے بھی بہت کچھ ترقی دی۔

غرض مذہب کے متعلق جس قدر ضروری اور مہتم بالشان علوم تھے گویا مذہب کے ساتھ پیدا ہوئے اور مسجدوں کے صحن یا عام مجلسوں میں ان کے مسائل رواج پانے لگے، خود صحابہؓ کے عہد میں ایسے متعدد اشخاص (۱) موجود تھے جو کثرتِ معلومات کے

(۱) ابن حزم نے ان کی تعداد بیس تک خیال کی ہے، دیکھو فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۳۸

ساتھ طرز استدلال، طریقِ استنباط، تخریجِ احکام میں اجتہاد کا حق رکھتے تھے اور زمانۂ مابعد میں جب صحابہؓ کے حالاتِ زندگی قلمبند ہوئے تو وہ مجتہدین کے لقب سے پکارے گئے، کچھ لوگ ایسے تھے جو حدیثوں کے یاد رکھنے میں مشہور تھے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے ۵۳۶۴، ابن عمرؓ سے ۲۶۳۰، انسؓ سے ۲۲۸۶، ابن عباسؓ سے ۱۶۶۰، جابرؓ سے ۱۵۴۰ حدیثیں مروی ہیں (۱)، چودہ صحابی مفسر تھے جو قرآنِ پاک کی فقہی اور تاریخی آیتوں کے متعلق نہایت کافی معلومات رکھتے تھے، باوجودیکہ ایک مدت تک قدیم یونانیوں کی طرح تعلیم وتعلم جو کچھ تھا زبانی تھا، تاہم سیکڑوں ہزاروں اشخاص ان مسائل کے سیکھنے سکھانے میں مصروف تھے اور تمام ممالک اسلامیہ میں حدیثیں اور فقہ کے مسائل اسی تیزی سے رواج پارہے تھے، جس طرح خود اسلام عالمگیر ہو رہا تھا، عرب کی بلند حوصلگی اور عظمت کے لیے حجاز ویمن کی وسعت کافی نہ تھی اس لیے ہزاروں صحابہؓ سرزمین عرب سے نکل کر تمام نئے فتح کیے ہوئے ملکوں میں پھیل گئے اور بعضوں نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی، اس طرح شام میں دس ہزار، کوفہ میں ایک ہزار، حمص میں پانسو، مصر میں کم وبیش تین سو صحابہ موجود تھے (۲)، یہ لوگ جہاں گئے حدیثوں اور عام مذہبی مسائل کا ذخیرہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے جو ان کی عظمت وقبول کا بہت بڑا قوی سبب ہوتا تھا، چنانچہ صرف ان صحابہؓ کی تعداد جن سے لوگوں نے حدیثیں سیکھیں یا روایت کی کم از کم ڈیڑھ ہزار بیان کی گئی ہے۔

ایک مدت تک کچھ اس تقلیدی خیال سے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلمبند کرنے کی طرف خود توجہ نہیں فرمائی اور کچھ اس وجہ سے کہ اہلِ عرب کو اپنے حافظہ کے بھروسے پر تدوین اور تصنیف کی چنداں پروا بھی نہ تھی، کاغذ اور قلم

(۱) دیکھو فتح المغیث صفحہ ۳۸۱ (۲) ایضاً صفحہ ۳۸۲ مصر کے صحابہ کے نام ونسب اور ان کی تعداد سیوطی نے ایک مستقل رسالے میں لکھی ہے جس کا نام درالسحابہ ہے، دیکھو حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر وقاہرہ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ صفحہ ۹۹

سے کام نہیں لیا گیا مگر جس قدر زمانہ کو امتداد ہوتا جاتا تھا ان روایتوں کے دفتر تیار ہوتے جاتے تھے، جن کو زبانی محفوظ رکھنا، انسانی قوت کا کام نہ تھا، غرض ۱۴۳ھ میں تالیف وتدوین شروع ہوگئی، ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک نے مدینہ میں، اوزاعی نے شام میں، ابن ابی عروبہ اور حماد نے بصرہ میں، معمر نے یمن میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں حدیث اور تفسیر کی کتابیں لکھیں، امام ابوحنیفہ نے دلائل کے ساتھ فقہ کو ترتیب دیا، ابن اسحاق نے مغازی وسیر کی تدوین کی (۱) یہاں تک کہ جب فضل بن یحییٰ برمکی کے اہتمام اور توجہ سے کاغذ بنانے کا کارخانہ جاری ہوگیا (۲) تو یہ علوم وفنون گھر گھر پھیل گئے، جس کثرت کے ساتھ مذہبی تصنیفیں ہوئیں اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف تفسیر کے متعلق سو سے زیادہ ایسے مضامین پیدا ہوگئے جن کو الگ الگ علم کا لقب دیا گیا اور ہر ایک پر متعدد اور بعض پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ (۳)

اس زمانہ میں اور دو علم مذہبی ضرورت سے ایجاد ہوئے، علم البیان وکلام، اسلام کا جو بڑا معجزہ اور جو ہمیشہ استعمال کیا جاسکتا ہے قرآن تھا، اس کے معجزہ ہونے کا دعویٰ جب اہل عرب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو کسی دلیل لانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، کفارِ عرب گو انکار کرنا چاہتے تھے مگر ان کا مذاقِ زباندانی اس دعویٰ کے تسلیم کرنے پر ان کو مجبور کرتا تھا، وہ منہ سے انکار کرتے تھے مگر قرآن پڑھے جانے کے وقت ان کی بے اختیار حالت، بے قصد تحسین، بے تابانہ تاثر ان کے اظہار کے خلاف شہادت دیتے تھے لیکن اسطرح پر یہ دعویٰ صرف عرب کے سامنے چل سکتا تھا، اہلِ عجم اولاً تو زبان عربی سے ناواقف اور واقف بھی ہوں تو عرب کا سا قدرتی ذوق کہاں سے لائیں، اس لیے ضرورت پڑی فصاحت اور بلاغت کے اصول مرتب کیے جائیں تاکہ دوسری قومیں اگر مذاق سے نہیں تو علمی طور پر اس دعویٰ کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں

---

(۱) تاریخ الخلفا سیوطی، خلافت منصور واقعات ۱۴۳ھ (۲) مقدمہ ابن خلدون فصل ۱۳۱ از فصل ۴

(۳) اتقان فی علوم القرآن میں مختصراً ان علوم اوران کے متعلق تصنیفات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

اول اول جعفر برمکی وزیر ہارون الرشید اور جاحظ نے کچھ قاعدے لکھے(۱) پھر متاخرین نے کلام کے ہر ایک حصہ کے متعلق مسائل استنباط کیے اور علامہ سکاکی کی مفتاح پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا، علم البیان یونانیوں کے ہاں بھی تھا لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ان کے خیالات سے مسلمانوں کو بہت کم آگہی ہوئی بلکہ بالکل نہیں ہوئی، تاہم ہم یقین کرتے ہیں کہ اگر یونانی زندہ ہوتے تو ہمارے علما کی دقتِ نظر اور قوتِ استنباط کی داد دیتے، علم کلام (۲) اس وقت پیدا ہوا جب یونانی علوم کے شائع ہونے سے مذہب اسلام فلسفہ سے ٹکرا گیا اور عام ظاہر بیں آنکھیں مذہبی اعتقادات کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، لیکن محققینِ اسلام کو پورا بھروسا تھا کہ ''سچ کو کوئی چیز صدمہ نہیں پہنچا سکتی'' انھوں نے غلط خیالات اور انسانی رایوں کو جو مذہب میں داخل ہوگئی تھیں چھانٹ کر الگ کر دیا اور پرزور منطقی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ فلسفۂ یونانی جس قدر کہ اسلام کے اصلی مسائل سے مختلف ہے، خود غلط اور باطل ہے، امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ اس فن میں پہلی تصنیف ہے جس کا تتبع امام رازی وغیرہ نے کیا اور اس ترقی کو پہنچایا کہ تہافۃ تقویم پارینہ کے برابر ہوگئی۔

اسلام اگرچہ فلسفہ سکھانے نہیں آیا تھا، تاہم ذات باری کے متعلق اس نے جو کچھ بتایا وہ فلسفہ کے بڑے حصے یعنی الٰہیات کی جان ہے، گبن صاحب لکھتے ہیں:

> ''محمدؐ کا مذہب شبہ اور ابہام سے آزاد ہے اور قرآن وحدانیت کا عمدہ ثبوت ہے، خدائے تعالیٰ کے باب میں آپ کا عقلی جوش مذہبی یہ تسلیم کرتا ہے کہ قابلِ عبادت ایک ذات غیر محدود اور قدیم بدون کسی صورت اور مکان اور بدونِ اولاد و مشابہت کے ہے جو ہمارے نہایت پوشیدہ خیالات میں حاضر ہے اور خاص اپنی قوت کی ضرورت سے موجود ہے، مسلمانوں کے ہر دلعزیز مذہب میں حکیم

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ذکر علم بیان (۲) یہ اس علم کلام کے علاوہ جس کا ذکر اوپر ہو چکا۔

موحد شریک ہوسکتا ہے اور یہ دین زمانہ حال کے ادراکات سے
شاید بہت عالی ہے کیوں کہ جب ہم ماہیت غیر محسوس سے تمام
خیالات زمان و مکان و حرکت و مادہ وحس و تامل کو علاحدہ کردیں تو
کون چیز تصور اور فہم کے لیے باقی رہے گی۔''

مسلمانوں کے مذہبی علوم کا یہ ایک مختصر ساخاکہ ہے، ان کے سوا مسلمانوں نے جن علوم وفنون پر کتابیں لکھیں ان کی تعداد تقریباً دو سو ہے، کشف الظنون اور مدینۃ العلوم میں ان کا بیان مع تصنیفات کی تفصیل کے مل سکتا ہے مگر مجھ کو یہ بھولنا نہ چاہیے کہ میرے مضمون کا عنوان ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' ہے نہ ''گذشتہ علوم''، مذہبی علوم جس طرز سے تعلیم دیے جاتے تھے ان کا تفصیلی بیان آگے آئے گا، مسلمانوں نے جو کچھ دوسری قوموں سے سیکھا وہ منطق، آلہی (۱)، ہندسہ، طبیعی و ہیئت تھے، حساب وطب میں بھی انھوں نے زیادہ تر دوسری قوموں کی شاگردی کی، اس بات کی بہت کم مثالیں ہیں کہ مسلمان عالموں نے خود یونانی وسریانی زبانوں کی تحصیل کی ہو اور اصل کتابوں سے یہ علوم سیکھے ہوں، بے شبہ خلفا کے درباروں میں مترجموں کا ایک گروہ موجود تھا مگر ہنری لوئیس صاحب کے چبھتے ہوئے اعتراض کا کچھ جواب نہیں ہے کہ ''ان میں اکثر عیسائی تھے'' حنین، حبیش، متی، یوحنا، اسحاق، یعقوب کندی وغیرہ جو بہت بڑے مترجم مشہور ہیں سب عیسائی تھے، حکماے اسلام میں صرف فارابی ایک ایسا شخص ہے جو ان زبانوں کا پورا ماہر تھا اور اس نے خود ایک عیسائی عالم یوحنا بن خیلان سے یہ علوم اور زبانیں سیکھیں تھیں، ارسطو کی کتابوں کی شرح اور توضیح میں بوعلی سینا اور ابن رشد بہت زیادہ نامور ہیں اور یورپ نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے تاہم مجھ کو شبہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک کو بھی یونانی یا سریانی زبان آتی ہو۔

---

(۱) خاص فلسفیوں کی الٰہی مراد ہے، ورنہ مسلمانوں نے الٰہی کے عمدہ مسائل خود قرآن مجید سے حاصل کیے تھے۔

ترجمے، مختلف عہدوں کی کوششیں

ترجموں کی صحت و غلطی، عام رائے

عام مورخین کا بیان ہے کہ اول جس نے ترجموں کی بنیاد ڈالی، وہ دولت عباسیہ کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور تھا لیکن میرا خیال یہ ہے کہ منصور کے حق میں مورخین کی یہ ایک بے جا فیاضی ہے، ہم کو دولت بنی امیہ میں بھی فلسفہ کا پتہ ملتا ہے اور اس کو تو اور زیادہ مدت گذری کہ عرب پر فلسفہ کا پرتو پڑنا شروع ہو چکا تھا، امیر معاویہ کے دربار میں ابن آثال نامی ایک عیسائی طبیب تھا، جس نے یونانی زبان کی بعض کتابیں عربی میں ترجمہ کیں (۱) اور ان کا پوتا خالد بن یزید المتوفی ۸۵ھ تو درحقیقت حکیم بنی امیہ کے لقب کا مستحق تھا، اس نے مریانس نام ایک رومی راہب سے کیمیا اور طب پڑھی تھی اس نے یونانی زبان دانوں کو جمع کیا اور ترجمے کی خدمت دی۔

اس کے عہد کا مشہور مترجم اصطفن تھا، جس نے چند اور مترجموں کی اعانت سے صنعت وغیرہ کی کتابیں ترجمہ کیں، جس اولیت کا تمغہ مورخوں نے منصور کے لیے تجویز کیا ہے، انصاف یہ ہے کہ اس کا مستحق خالد تھا (۲) مروان بن الحکم کے زمانے میں ماسرجویہ ایک یہودی عالم نے جس کی مادری زبان سریانی تھی ہراون قس کی ایک کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں کیا، عبدالملک کے بعد غالباً فلسفہ پر کچھ توجہ نہیں ہوئی یہاں تک کہ ۱۳۱ھ میں زمانے نے بنوامیہ کی حکومت کا ورق الٹ دیا۔

۱۳۷ھ میں جب منصور عباسی بغداد کے تخت پر بیٹھا تو ترجمہ و تصنیفات پر

(۱) دیکھو نامۂ دانشوران ناصری مطبوعہ ایران حالات ابن آثال (۲) دیکھو ابن خلکان، حالات خالد اور کشف الظنون جلد سوم ص ۹۶، علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں خالد کے علم و فضل و واقفیت فلسفہ سے متعجبانہ انکار کیا ہے مگر ابن خلدون کے خلاف بہت سی معتمد شہادتیں موجود ہیں۔

حوصلۂ شاہانہ سے توجہ کی، قیصر روم کو خط لکھ کر فلسفہ کی کتابیں منگوائیں اور چونکہ اس وقت تک دار الخلافہ میں ان زبانوں کے جاننے والے موجود نہ تھے یہ بھی فرمائش کی کہ جو کتابیں آئیں وہیں سے عربی میں ترجمہ ہو کر آئیں، چنانچہ اقلیدس اور کچھ طبعیات کی کتابیں مع ترجمہ کے بغداد میں پہنچیں، علمائے اسلام ان کو پڑھ کر اور بھی مشتاق ہوئے (۱) منصور کا شوق علمی دیکھ کر دور دور سے مترجمین اور حکما اس کے دربار میں آنا شروع ہوئے۔ جرجیورس، فرات بن سحنا ثاعیسیٰ، بطریق (یہ سب عیسائی عالم تھے) نو بخت منجم، ابوسہل (مجوسی تھے)، ابن المقفع اس کے دربار کے مشہور مترجم اور حکیم تھے (۲)، بطریق نے یونانی اور ابن المقفع نے فارسی زبان سے ترجمہ کیے، ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی داں ہندو عالم منصور کی پایہ شناسی کا شہرہ سن کر دار الخلافہ میں داخل ہوا، اس نے ایک نہایت عمدہ زیچ جس کو اس نے ایک عمدہ اور جامع تصنیف سے جو ایک بادشاہ ہندوستان مسمی بہ بیگر کی طرف منسوب ہے خلاصہ کیا تھا، منصور کی خدمت میں پیش کی، محمد بن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے عربی زبان میں اس کا ترجمہ کیا اور اس سے ایک کتاب مرتب کی جو ریاضی دانوں میں ''سند ہند'' کے نام سے مشہور ہے، مامون الرشید کے زمانے تک اعمال کواکب میں اسی زیچ پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ (۳)

---

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۱۹ مطبوعہ بیروت (۲) دیکھو مختصر الدول حالات حکمائے عہد منصور یہ ایک مختصر اور مفید تاریخ ہے، جو ابوالفرج ملطی ایک عیسائی عالم کی تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، ڈاکٹر پوکاک پروفیسر آکسفورڈ کالج نے لیٹن میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اصل کتاب مع ترجمہ لیٹن ۱۶۶۳ھ میں بمقام لندن چھاپی گئی ہے، جہاں کہیں اس آرٹیکل میں مختصر الدول کا نام آئے اس سے یہی تاریخ مراد ہے، ابن البطریق وابن المقفع کے لیے دیکھو کشف الظنون حرف حاذ کر حکمت (۳) یہ تفصیل مع حالات زائد جامع القصص الہندیہ میں ہے، جو ہندوستان کے حالات میں چند رسالوں کا ایک مجموعہ ہے اور فرانس میں بمقام بن ۱۸۳۸ء میں چھپا ہے۔

منصور کے نامور فرزند مہدی نے اگرچہ اس طرف کچھ توجہ نہیں کی بلکہ ایک محکمۂ تحقیقاتِ زنادقہ قایم کر کے آزادیٔ رائے کو بالکل روک دیا لیکن خاندانِ برامکہ نے جو اس کے عہد میں سلطنت کا ایک بڑا رکن تھا، اس باب میں بڑی ناموری حاصل کی، ان کے اہتمام سے یونانی اور فارسی کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں، ابن ناعمہ، سلام ابرش (۱)، عبداللہ اہوازی ان کے عہد کے نامور مترجم تھے، ہارون الرشید اعظم نے جس کے نام سے یورپ و ایشیا دونوں واقف ہیں، پچھلی کوششوں میں اور بہت کچھ اضافہ کر دیا، اس نے ترجمہ اور تصنیفات کا ایک بڑا محکمہ قایم کیا، جس میں ہر زبان کے بڑے بڑے ماہر تصنیف اور ترجمہ کے کام پر مامور تھے (۲)، یوحنا بن ماسویہ ایک عیسائی عالم جس کی مادری زبان سریانی تھی، قدیم یونانی طب کی تصنیفات کے ترجمے کے لیے انتخاب کیا گیا، اس محکمہ سے جس کو بیت الحکمۃ کہتے تھے، ژند، یونانی، شامی، سنسکرت زبانوں کے ترجمے ہمیشہ تیار ہوتے تھے اور اشاعت پاتے تھے، منکہ اور صالح دو ہندو حکیم اس کے دربار میں تھے جو ترجموں کے علاوہ صاحبِ تصانیف بھی تھے، شاناق ہندی کی کتاب السموم منکہ ہی نے فارسی میں ترجمہ کرائی تھی، چرک اور ششرت کی تصنیفات طبی جو عربی میں ترجمہ ہوئیں غالباً اسی عہد میں اور انھیں ہندو حکیموں کے اہتمام میں ہوئیں۔ (۳)

---

(۱) ابن ناعمہ اور سلام ابرش کا ذکر بحیثیت مترجمین برامکہ صاحب کشف الظنون نے حکمہ کے ذکر میں کیا ہے، آگے فہرست میں چند کتابوں کے نام ملیں گے جو ملا یکہ کے لیے ترجمہ کی گئیں۔
(۲) ان ترجموں کا ذکر پامر صاحب کی تاریخ ہارون الرشید ص ۲۲۲ و چیمبرس انسائیکلو پیڈیا جلد اول مطبوعہ لندن ۱۸۸۶ء ص ۳۴۷، اور کشف الظنون میں صراحۃً اور ضمناً ملے گا۔ (۳) الفنسٹن صاحب نے تاریخ ہندوستان حصہ مسلمانان میں لکھا ہے کہ منکہ و سالی دو ہندی طبیب ہارون الرشید کے دربار میں تھے، الفنسٹن صاحب نے صالح کو سالی پڑھا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے، شاناق کا اصلی نام شاید سنگھ ہو جو عربی خراد پر چڑھ کر شاناق ہو گیا ہے، چرک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کئی سو برس پہلے ایک طبیب تھا۔

اب تک جو کچھ ہوا تھا گو بہت کچھ تھا مگر مامون الرشید کے فیاضانہ حوصلوں کے سامنے تمام پچھلی کوششیں گمنامی کے پردے میں چھپ گئیں، مورخین نے مامون کے اس جوشِ التفات کی ایک عجیب دلچسپ حکایت لکھی ہے یعنی ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک محترم شخص تخت پر جلوہ فرما ہے، مامون نے بڑھ کر پوچھا آپ کون بزرگ ہیں، تخت نشین نے کہا: ارسطو، مامون پھڑک اٹھا اور عرض کی اے حکیم! اچھی کیا چیز ہے، خیالی ارسطو نے جواب دیا کہ جسے عقل اچھا کہے، دوبارہ مامون نے درخواست کی کہ میرے لیے کچھ نصیحتیں ارشاد ہوں، جواب ملا کہ ''توحید اور صحبت نیک''، خواب کا کچھ اثر ہوا ہو یا نہیں مگر اس واقعہ سے مامون کے شوق اور محویت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، غرض سبب جو کچھ ہو مامون نے قیصر روم کو نامہ لکھا کہ ارسطو کی کل تصانیف بہم پہنچائی جائیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ خلفا کے معمولی خطوط قیصر و فغفور پر فرمان کا اثر رکھتے تھے، قیصر تعمیل ارشاد کے لیے آمادہ ہوا مگر روم کے اطراف میں فلسفہ خود گمنام ہو چکا تھا، بڑی تلاش سے ایک راہب ملا جس نے پتہ دیا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانہ سے مقفل ہے اور جتنے تاجدار تخت نشین ہوتے گئے قفلوں کی تعداد بڑھاتے گئے، قسطنطین نے اس مکان میں اس غرض سے فلسفہ کی کتابیں بند کرادی تھیں کہ اگر فلسفہ و حکمت کو آزادی ملی تو دینِ مسیحی کو سخت صدمے اٹھانا پڑیں گے، قیصر روم کے حکم سے یہ پرخطر خزانہ کھولا گیا، تاہم خیال ہوا کہ مسلمانوں کے ساتھ اس قسم کی فیاضی مذہباً ممنوع تو نہ ہو لیکن ارکانِ دولت نے قیصر کی تسکین کردی کہ اچھا ہے، فلسفہ مسلمانوں میں پہنچا تو ان کے مذہبی جوش کو بھی ٹھنڈا کر کے رہے گا، غرض پانچ اونٹ لاد کر فلسفہ کی کتابیں مامون کی خدمت میں روانہ کی گئیں۔ (۱)

مامون نے خود بھی حجاج بن المطر و ابن البطریق کو جو یونانی و سریانی زبان کے بڑے ماہر تھے، اس غرض سے روم بھیجا کہ اپنی پسند سے کتابیں انتخاب کر کے

(۱) ناسخ التواریخ مولفہ لسان الملک سپہر جلد اول حالات ارسطو کے ذیل میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

لائیں، بیت الحکمۃ کا منیجر اور افسر جس کا نام سلما تھا وہ بھی ان دونوں کے ساتھ گیا(۱) مامون نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جیسا کہ گبن صاحب (۲) لکھتے ہیں، اس کے کارندوں نے آرمینیہ، شام، مصر میں فنون یونانی کی کتابیں جمع کیں جس کا ترجمہ اس کے حکم سے نہایت حاذق مترجم نے زبان عربی میں کیا، اسی زمانہ میں قسطا بن لوقا بعلبکی ایک عیسائی فلاسفر اپنے شوق سے روم گیا اور فلسفہ کی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لایا، مامون نے اس کی شہرت سے مطلع ہوکر بلا بھیجا اور بیت الحکمۃ میں ترجمہ کے کام پر مقرر کیا(۳)، سہل بن ہراون کو جو ایک فارسی النسل حکیم تھا فارسی کتابوں کے ترجمہ کا اہتمام سپرد ہوا(۴)، سب سے بڑا نامور حکیم اور مختلف زبان کا ماہر اور مترجم یعقوب کندی تھا جو خاص تصنیفاتِ ارسطو کے ترجمہ پر مامور تھا(۵)، وہ ایک عیسائی امیر تھا اور اس کا باپ کوفہ کا گورنر رہ چکا تھا، فارسی، ہندی، یونانی زبان جانتا تھا اور مامون کا نہایت معتمد اور مقرب تھا، غالباً مامون نے خود بھی یونانی زبان سیکھ لی تھی، چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں ہے(۶): ’’مامون نے یونان کے بادشاہ کو پانچ ٹن سونا دینا اور صلح دائمی کا اس شرط پر وعدہ کیا کہ حکیم لیو کو اجازت دی جائے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے آکر مامون کو فلسفہ سکھا جائے۔‘‘

فلسفہ کے لیے اتنی قیمت صرف کرنے کی مثال بہت کم مل سکتی ہے، شاکر منجم کے تینوں بیٹے محمد واحمد وحسن نے بھی جو ہندسہ و نجوم و موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اور مامون کے خاص مقرب اور ندیم تھے، اس کام پر بہت توجہ کی، اپنے ذاتی شوق سے روم کے اطراف میں قاصد بھیجے اور فلسفہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں منگوائیں،

---

(۱) یہ پوری تفصیل کشف الظنون باب الحکمۃ میں ہے۔ (۲) گبن صاحب کی رومن امپائر حصۂ مسلمانان، باب سوم آغاز دولت عباسیہ (۳) مختصر الدول حالات یعقوب کندی (۴) فوات الوفیات ترجمہ سہل بن ہراون (۵) ہسٹری آف فلاسفی مصنفۂ ہسری لوئیس صاحب فلسفۂ عرب حالات یعقوب کندی (۶) کتاب مذکور ذکر عرب

دور دراز ملکوں میں قاصد بھیج کر مترجم بلوائے اور ان کتابوں کے ترجموں پر مامور کیا(۱) ، مامون کی نیت کا پھل تھا کہ ان نامور بھائیوں کی کوشش بھی مامون کے کارنامہ میں لکھی گئی، اس عہد میں جن زبانوں کے ترجمے ہوئے وہ یونانی، فارسی، کالڈی، قبطی، شامی زبانیں تھیں۔

ہارون الرشید کا پوتا متوکل باللہ بھی اسی قسم کی فیاضیوں میں نامور ہوا، مترجموں میں جس نے کثرت اور عمدگی تراجم کے لحاظ سے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ہے وہ متوکل ہی کے عہد کا نامور حکیم حنین بن اسحاق تھا، حنین نے بلاد رومیہ میں دو برس مستقل رہ کر یونانی زبان اور فلسفہ کامل طور سے سیکھا، روم سے واپس آکر وہ بصرہ چلا گیا اور خلیل بن احمد بصری سے عربیت کی تحصیل کی اور چونکہ دونوں زبانوں کا پورا ماہر ہو چکا تھا، اپنے شوق سے فلسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنی شروع کیں، اس کی شہرت روز افزوں نے اس کو متوکل باللہ کے دربار میں پہنچایا، متوکل نے بیش قرار تنخواہ اور جاگیریں مقرر کر دیں، حنین کا ایک بیٹا اسحاق اور اس کا بھانجا حبیش یہ دونوں بھی یونانی و سریانی زبان کے بڑے ماہر تھے، اس لیے محکمہ ترجمہ میں مقرر ہوئے، عربی میں جو ترجمے ہوئے اکثر اسی اسحاق و حنین کی طرف منسوب ہیں۔(۲)

حنین بن اسحاق و ثابت بن قرہ و حبیش بن الحسن اور دوسرے نامور مترجموں میں سے ہر ایک کی ماہانہ تنخواہیں پانسو اشرفیاں تھیں(۳)، معتضد باللہ کے عہد کا مشہور مترجم ثابت بن قرہ حرانی ہے، ثابت نے محمد بن موسیٰ کے گھر میں پرورش پائی اور اس کی سفارش سے معتضد کے دربار میں داخل ہوا، معتضد اس کی نہایت عزت کرتا تھا حتیٰ کہ وزراء اور خواص بھی اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے(۴)، ترجموں کا اہتمام اور بیت الحکمۃ کا انتظام غالباً دوسو برس سے زیادہ قایم نہ رہا، کیوں کہ اتنی مدت کی

(۱) ابن خلکان ترجمہ محمد بن موسیٰ (۲) یہ تمام تفصیل مختصر الدول عہد متوکل میں موجود ہے۔
(۳) ناسخ التواریخ جلد اول حالات ارسطو (۴) مختصر الدول

پیہم تلاش اور جستجو میں روم و یونان کا کوئی علمی خزانہ ایسا باقی نہیں رہا جو اہل عرب کی آنکھوں سے چھپا رہ گیا ہو، اس کے علاوہ اس مدت میں مسلمان فلاسفروں کا ایک بڑا گروہ تیار ہو چکا تھا، اسحاق، ابومعشر، محمد بن موسیٰ، احمد سرخسی، ابونصر فارابی وغیرہ حکما کی تازہ اختراعات اور خاص تصنیفات نے فلسفہ کو فلاطون و ارسطو کی اطاعت سے آزاد کر دیا تھا (۱) تاہم خلفا کا دربار ایک مدت تک ہر ملت اور مذہب کے فلاسفروں سے بھرا رہا، جو اپنے ذاتی شوق یا بعض اوقات خلفا کی فرمائش سے تصنیفات کے علاوہ دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کرتے تھے، راضی باللہ کے عہد خلافت قریباً ۳۴۴ھ میں متی بن یونس منطق کا بڑا عالم مشہور ہوا اور ارسطو کی بعض کتابیں ترجمہ کیں (۲)، ہنری لوئیس صاحب ہسٹری آف فلاسفی میں لکھتے ہیں: ''دسویں صدی عیسوی میں یحییٰ بن عدی اور عیسیٰ بن زرع نے نئے ترجمے کیے اور پہلے ترجموں کی اصلاح کی، اسی طرح محمد بن یحییٰ جوز جانی جو ۳۴۸ھ میں تھا اور ابوالفرج المتوفی ۴۳۵ھ وغیرہ نے سریانی وغیرہ سے نئے ترجمے کیے اور شرحیں لکھیں (۳)، ابوریحان بیرونی جو بوعلی سینا کا معاصر اور فلسفہ و ہیئت میں اس کا حریفِ مقابل تھا ہندوؤں کے علوم کے شوق میں ہندوستان گیا اور برسوں رہ کر فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کی، سنسکرت سے ایسی واقفیت حاصل کی تھی کہ ہندوؤں کو فلسفۂ یونان کے مسائل ان کی زبان میں سکھائے اور اس طرح ہندوستان کی شاگردی کے حق سے بھی ادا ہو گیا (۴)، محمد بن اسماعیل تنوخی نے بھی ہیئت و نجوم سیکھنے کے لیے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور وہاں رہ کر علوم و فنون کی تحصیل کی۔

---

(۱) گبن صاحب لکھتے ہیں کہ حکمائے مسوع، جابر، رازی، ابن سینا کے نام حکمائے یونانی کے ہم پلہ کیے گئے ہیں، غالباً یہ یورپین شہادت زیادہ قابل اعتبار ہوگی۔ (۲) مختصر الدول (۳) ایضاً

(۴) دیکھو جامع القصص الہندیہ و مختصر الدول، بیرونی کی ایک کتاب جس میں سفر ہندوستان اور یہاں کی معاشرت اور تمدن کا حال اس نے لکھا ہے، لندن میں نہایت اہتمام سے چھاپی گئی ہے، جس پر پروفیسر سی شو نے جو جرمن کا مشہور عالم ہے ایک دیباچہ لکھا ہے، بیرونی کے شوق علمی اور تحقیقات کا اندازہ اس دیباچہ سے ہوسکتا ہے۔

بعض اتفاقی طریقوں سے بھی مسلمانوں کو دوسری قوموں کے خیالات و مسائل معلوم ہوئے، جس زمانہ میں فتوحاتِ اسلامی کا سیلاب ہندوستان کی سرحد کے اونچے اونچے مقامات سے گذر رہا تھا، بنارس کا ایک صوفی عالم جس کا نام بھوجر برہمن تھا، مسلمانوں سے مذہبی مباحثہ کے لیے روانہ ہوا اور سلطان علی مرد کے زمانہ میں شہر اکفوت پہنچ کر قاضی رکن الدین سمرقندی سے ملاقات کی، مباحثہ کا ارادہ تو جاتا رہا بجائے اس کے علوم عربیہ سیکھنے شروع کیے، اس نے قاضی صاحب کی خدمت میں ایک کتاب جس کا نام انبرت کنڈ تھا پیش کی اور اس کے مطالب بیان کیے، قاضی صاحب اس کے مسائل سے پوری آگہی حاصل کرنے کے ایسے شایق ہوئے کہ اس سے سنسکرت پڑھنی شروع کی اور اصل زبان سے واقف ہوکر پہلے فارسی میں اور پھر عربی میں کتاب مذکور کا ترجمہ کیا، تاہم اس کے مشکل مقامات ہنوز شرح کے محتاج تھے، اتفاق سے بھوجر کا ایک شاگرد انبھوانا تھ بلادِ اسلامیہ میں پہنچا تو ایک سنسکرت داں عالم نے اس سے یہ کتاب پڑھی اور عربی زبان میں اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا، جس کا نام مراۃ المعانی لادراک العالم الانسانی ہے۔(۱)

سلطان فیروز شاہ والیِ ہندوستان قریباً ۷۷۲ھ میں جب جوالامکھی پہاڑ پر گیا تو لوگوں نے اطلاع کی کہ اس بت خانہ (۲) میں ۱۳سو کتابیں قدیم زمانہ کی موجود ہیں، فیروز شاہ نے ان کے ترجمہ کیے جانے کا حکم دیا اور موسیقی و نجوم وغیرہ کی تصنیفات ترجمہ کی گئیں، نجوم کی ایک کتاب عزالدین نے نظم میں ترجمہ کی۔

علوم وفنون کے تراجم کی یہ ایک مختصر سی تاریخ ہے، اب ہم کو دیکھنا ہے کہ کس

---

(۱) یہ پوری تفصیل جامع القصص الہندیہ میں مذکور ہے، یہ پہلی مثال ہے کہ ایک عربی داں مصنف نے سنسکرت یا بھاشا الفاظ کو صحیح اور پورا ادا کیا ہے، جس طرح میں نے یہ سب پورے نام لکھے ہیں، اصل کتاب میں بھی اسی طرح ہیں۔ (۲) دیکھو تاریخ بدایونی، حالات فیروز شاہ، ان کتابوں میں سے بعض کے ترجمے مثلاً رزم نامہ وغیرہ لاہور میں بدایونی نے خود بھی دیکھے۔

قسم کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اوراس انتخاب کے کیا اسباب تھے، ان ترجموں کو اسلامی تصنیفات سے کیا تعلق ہے، ان ترجموں کی صحت پر کہاں تک اعتبار ہوسکتا ہے، مسلمانوں نے اس کام میں دوسری قوموں کا احسان کیوں اٹھایا اور خود ترجمہ کرنے پر کیوں نہیں مائل ہوئے، جہاں تک ہم کو معلوم ہے طب اور فلسفہ کے سوا جس میں منطق، طبعی، الٰہی، موسیقی، فلکیات، ہیئت، ہندسہ، حساب، جبر، مقابلہ وغیرہ شامل ہیں اور علوم کی تصنیفات کم ترجمہ ہوئیں۔

اصل یہ ہے کہ عرب مسلمانوں کو اپنی زبان اور مذہب پر اس قدر ناز تھا کہ وہ دوسری قوموں کی ان تصنیفات کو ہمیشہ بے پروائی کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور واقعی جو شخص فصاحت و بلاغت کے متعلق جزئیات کے انضباط، قواعد کی ترتیب، مسائل کے استنباط میں ان کی موشگافیاں دیکھے گا، مان لے گا کہ ایسے نکتہ دانوں کو علم انشا میں کسی قوم کا زلہ ربا ہونا نہیں چاہیے، علامہ ابن اثیر جس نے علم البیان کو بہت کچھ ترقی دی ہے، فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ ''میں یونانی زبان مطلق نہیں جانتا اور اس فن کے متعلق ان کے خیالات سے بالکل ناآشنا ہوں''، یونانی و رومی تصنیفات، فلسفہ و طب کے سوا زباندانی یا مذہب سے متعلق تھیں، مسلمانوں نے بے شبہ نادانستہ ان دونوں سے بےاعتنائی کی اور افسوس ہے کہ اس غیر معتدل فخر نے ان کو دوسری قوموں کے علم تاریخ سے بھی محروم رکھا۔

مسلمان فلسفہ وطب کے پہلے مرحلے میں بےشبہ یونان وروم کے احسان مند ہیں، ان کی تصنیفات کے ہر صفحے سے اس احسان مندی کا اظہار ہوتا ہے اور سچ یہ ہے کہ افلاطون وارسطو (وغیرہ) کے ناموں کو عموماً اسلامی ممالک نے جو عزت دی یونان میں ان کو نصیب نہ ہوئی ہوگی، لیکن مسلمانوں نے ایک ذرہ پایا تھا اور اس کو آفتاب بنا دیا، ہیئت کو بہت کچھ ترقی دی، طبعیات کے متعلق ارسطو کی بہت سی غلطیاں دریافت کیں، منطق کو بالکل نئے طرز سے ترتیب دیا اور چند اصول اضافہ کیے، نئے نئے

آلات رصد یہ ایجاد کیے، نور کی رفتار دریافت کی، علم مناظر میں انعکاس کا قاعدہ معلوم کیا، جبر ومقابلہ جو چند جزئی مسئلوں کا نام تھا انھیں کی طباعی سے ایک علم کے رتبہ پر پہنچ گیا، دواسازی، نسخوں کی ترتیب، عرق کھینچنے کے آلے، موالید ثلاثہ کی تحلیل، تیزابوں کے فرق باہمی اور مشابہت کا امتحان، انھیں کی ایجادات سے ہیں، کیمسٹری کی انھیں نے بنیاد ڈالی، علم نباتات میں اپنے تجربوں سے دو ہزار پودے اور اضافہ کردیئے (۱)، غرض آج یونانی وعربی تصنیفات کا کوئی شخص اگر موازنہ کرے تو قطرہ و دریا کا فرق پائے گا۔

عیسائی مترجموں کو بے شبہ ترجمے کا فخر حاصل ہے، لیکن مسلمان دعوی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مستقل مرتب جامع تصنیفات کے سامنے یہ ترجمے تقویم پارینہ سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ چند روزوں کے بعد ترجموں کا کسی کو خیال نہیں رہا اور دنیا میں جس چیز نے علوم وفنون کو ناپید ہونے سے بچالیا وہ خاص اسلامی تصنیفات تھیں، آج مسلمانوں کی بڑی بڑی لائبریریوں میں ترجمے کا پتہ بھی نہیں ہے اور جن لوگوں کی قسمت میں یورپ کا استاد بننا لکھا تھا مثلاً بوعلی سینا، ابن طفیل، محقق طوسی، امام غزالی وہ ان ترجموں کے کبھی احسان مند نہیں ہوئے۔

ترجموں کی صحت وغلطی کی نسبت ہم کوئی خاص فیصلہ نہیں کر سکتے، آج یورپ عربی و یونانی دونوں زبانوں پر قابض ہے، قریباً دو سو برس تک اس نے عربی ہی کے ذریعہ سے فلسفہ کی تحصیل کی ہے، اس وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ بعض قدیم تصنیفات (مثلاً پانچویں اور چھٹی اور ساتویں جلدیں تراشہائے مخروطی مصنفہ اپالونیس پرجیس

(۱) اگر زمانے نے مساعدت کی تو ان تمام باتوں کی تفصیل اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمانوں کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے اور ان کی کوششوں نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھادیا، ایک مستقل رسالے میں لکھوں گا اور شاید اسی انجمن کے کسی دوسرے جلسے میں اس کے پیش کرنے کا اتفاق ہو۔

APOLO NIUSPERGEOUS وغیرہ ذلک) عربی ہی زبان کے ذریعہ سے محفوظ ہیں، ورنہ ان کی اصل جاتی رہی ہے، یورپ اسلامی کوششوں کا ممنون ہے اور امید ہے کہ ان ترجموں کی نسبت اس کا فیصلہ تعصب کی آلایش سے خالی ہوگا، گبن صاحب لکھتے ہیں: ''ان عربی ترجموں کی خوبی پر رناوٹ (RENAUDOT) نے خوب بحث کی ہے اور گسیرا (GASIRA) نے دیانت داری سے اس کی حمایت کی ہے، ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لوئیس (G. HENERY LEWES) میں ہے، منک کہتا ہے کہ ''بعض ترجمے نہایت خوبی سے کیے گئے''، لیکن ایک فرانسیسی مصنف کا بیان ہے کہ ''اکثر ترجمے اصل یونانی سے نہیں بلکہ شامی ترجموں سے ہوئے اور ترجمہ در ترجمہ ہونے کی وجہ سے بہت غلطیاں رہ گئیں''، گوہم اس امر کو کسی قدر تسلیم کرتے ہیں اور نہ صرف اسی بنا پر بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ترجمہ گو کتنا ہی عمدہ ہوتا ہم یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا ہے کہ اصل مطلب بالکل پورا پورا ادا ہوگیا لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی غلطیوں نے اسلامی تصنیفات پر کوئی محسوس اثر پیدا نہیں کیا، مسلمان فلاسفر، یونانی فلاسفروں کی اصلی غلطیوں کے درست کرنے والے تھے، ان جزئی غلطیوں سے ان پر کچھ اثر نہیں ہوسکتا تھا۔(۱)

مسلمانوں کا خود ترجمہ کرنے کی طرف مائل نہ ہونا گبن صاحب کے نزدیک اسی فخر اور غرور کا اثر ہے جو عرب کا اصلی خاصہ ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ''اہل عرب اپنی ملکی زبان کی کثرت الفاظ پر بھروسہ کرکے غیر زبان کے محاورہ کو حقیر سمجھتے تھے، انھوں نے اپنی عیسائی رعایا میں سے یونانی مترجم چھانٹے''، عرب کی پرفخر طبیعت کا خاصہ ہم کو بھی معلوم ہے لیکن افسوس ہے کہ گبن صاحب کی بدگمانی نے اس کا اندازہ اعتدال سے

---

(۱) طبعیات میں ارسطو اور موسیقیات میں فیثاغورث پر بوعلی سینا و فارابی نے جو قابل قدر نکتہ چینیاں کی ہیں وہ عام طرح سے مشہور ہیں، ہنری لوئیس صاحب نے بھی مانا ہے کہ فارابی نے فیثاغورث کی غلطیاں درست کردیں۔

زیادہ کیا ہے، اصل یہ ہے کہ عرب میں فلسفہ کا چرچا منصور عباسی کے عہد سے اور اسکے ذاتی شوق سے شروع ہوا، یہ وہ وقت تھا کہ مذہبی بے شمار روایتوں اور مسائل کے انبار کا لوگوں کی قوتِ حافظہ پر ایک بڑا بھاری بوجھ تھا اور سب کو یہ پڑی تھی کہ کاغذ کے حوالے کر کے ذرا سبکدوش ہوں، مذہبی علوم کے بہت سے مبادی اور مقدمات بھی مرتب کرنے تھے، اسلام کا جوش ابھی شباب پر تھا اور کم وبیش ہر مسلمان میں اس کا اثر پایا جاتا تھا، یہ ظاہر ہے کہ ایک سرگرم مذہبی گروہ کو اپنے مذہبی علوم اور مسائل کے سامنے دوسری باتوں پر کس قدر توجہ ہوگی، اس وقت تعلیم یافتہ گروہ حدیث، فقہ، تفسیر، اسماء الرجال وغیرہ کی تدوین وترتیب میں مصروف تھا، اس پر طرہ یہ ہوا کہ فلسفہ کا جو کچھ تھوڑا بہت رواج ہوا اس نے طبیعتوں میں آزادی پیدا کر دی اور بڑے بڑے نامور امام ومجتہد اس خیال سے اس کے مخالف ہوگئے کہ فلسفہ ومذہب ایک ساتھ بسر نہیں کر سکتے۔

خلفا (وہ بھی سب نہیں) بے شبہ فلسفہ کے حامی تھے، لیکن گبن صاحب خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یونانی زبان سیکھنے سے ان کو مہمات ملکی مانع تھے یا دوسری قوموں کی زبانوں کی حقارت، کئی صدیوں تک فلسفہ ایوانِ خلافت کا خاص مہمان رہا، تیسری صدی کے بعد البتہ اس نے قبولِ عام کی سند حاصل کی لیکن اس وقت جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں بے شمار ترجمے اور اسلامی تصنیفیں موجود تھیں اور فلسفہ حاصل کرنے کے لیے یونانی ورومی زبانوں کا دریوزہ گر ہونا چنداں ضروری نہ تھا۔ یہ خیال بھی کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ ترجمہ کے کام میں مسلمان سرے سے شریک ہی نہیں ہوئے، عبدالکریم شہرستانی نے ملل ونحل میں جہاں مترجموں کے نام لیے ہیں ان میں ہم کو مسلمانوں کے بھی نام ملتے ہیں مثلاً ابوسلیمان بن بکر مقدسی، یوسف بن محمد نیشاپوری، ابوزید احمد بلخی، ابوالحارث حسن بن سہیل قمی، احمد بن محمد اسفرائی، طلحہ النسفی اور محمد بن ابراہیم فزاری، سہل بن ہراون، ابوریحان بیرونی، محمد بن اسماعیل تنوخی، قاضی رکن الدین وغیرہ بھی تو

آخر مسلمان ہی تھے، بہت سے اوالعزم خلفا اور امرا کی پیہم کوششوں نے ترجموں کی تعداد جس قدر کثیر کردی ہے اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، تاہم نمونے کے طور پر میں چند ترجموں کی ایک فہرست ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں، میں نے ان ترجموں کو مطلقاً چھوڑ دیا ہے، جن کے مترجموں کے نام یا ان کے زائد حالات میں نہیں معلوم کرسکا ہوں، جن حکما کی کتابوں کے ترجمے ہوئے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

Ammouius, Themistian, Pyrianus, Sunpheius, Philoponus, Pythagoras, Diogenes, Dimocritus, Hippocrates, Socrates, Aristatle, Archumeden, Galen, Plolemy, Appollouius, Pengacaun, Plato

ثادذوسبوس، مانالاوس، برقلس، ارسطیقوس، ویقوریدس، اوطوقولس، باربوقا، قسطوس، ابقلاوس، ابلینوس، نیقولاؤس، بولوس، لاحانطی، ویوقنطوس۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
الٰہیات	ارسطو	یحییٰ بن عدی وغیرہ	اسحاق بن حنین، ابن عدی، اسطاث الکندی، ابوالبشر متی ہر ایک نے اس کا پورا ترجمہ کیا اور بعض مقالوں کا حنین بن اسحاق نے بھی۔
السماع الطبعی	،،		آٹھ مقالوں میں ہے، شیخ بوعلی سینا اور دوسرے علماے اسلام نے اس کی تفسیر کی ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب السماء و العالم	ارسطو	متی	یہ کتاب چار مقالوں میں ہے، قاضی ابوالولید ابن الرشد نے اس کا خلاصہ کیا (معجب)
کتاب النیازک	،،		حنین بن اسحاق نے اس کی شرح لکھی اور خلاصہ کیا۔
کتاب جرمی الشمس والقمر وبعدھما	،،		علامہ نصیر الدین طوسی نے اس کی اصلاح کی۔
کتاب النبات	،،	اسحاق	دو مقالے ہیں، ثابت بن قرہ نے اصلاح کی۔
کتاب المرأۃ	،،	حجاج بن مطر	
کتاب الحس والمحسوس	،،	متی بن یونس	قاضی ابوالولید نے اس کا خلاصہ کیا اور شرح لکھی (معجب) تین مقالوں میں ہے۔
سرالاسرار	،،		مامون رشید کے حکم سے ترجمہ ہوئی، اس میں سکندر کے لیے ارسطو نے وصیتیں کی ہیں۔
کتاب السیاسۃ	،،		سات مقالون میں ہے، اس کو ارسطو نے سکندر کے لیے لکھا تھا۔
کتاب الاخلاق	،،	حنین بن اسحاق و یحیٰی بن عدی وغیرہ	اس میں بارہ مقالے ہیں، فرفوریوس نے اس کی تفسیر کی ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب النفس	،،		حنین نے پوری کتاب کا ترجمہ سریانی میں کیا اور بعض مقالوں کا اسحاق نے، ثامسطیوس نے اس کتاب کی جو مبسوط شرح لکھی تھی اس کا ترجمہ اسحاق نے ایک خراب نسخہ سے کیا اور پھر ایک عمدہ نسخہ سے مقابلہ کر کے صحیح کیا۔
قاطیغوریاس	،،	حنین بن اسحٰق	یعنی مقولات عشر، ابونصر فارابی، ابوبشر متی، ابن مقفع، وابن بہرین وکندی واسحٰق بن حنین واحمد بن طبیب ورازی نے شرحیں لکھیں۔
باریمیناس	،،	،،	یعنی مباحث الفاظ، حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ نحوی وابوبشر متی، وفارابی نے شرحیں لکھیں، اسحاق بن مقفع کندی، ابن بہرین رازی، ثابت بن قرہ، احمد بن طبیب نے ملخص اور مختصر کیا۔
انالوطیقا	ارسطو	ثیاوزوس	یعنی تحلیل قیاس، حنین نے سریانی میں اور اسحاق نے عربی میں اس کے بعض اجزا ترجمہ کیے، یحییٰ نحوی

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			وکندی نے اس کی شرح لکھی، ابو بشر متی نے دو مقالوں کی شرح کی
انولویطیقاے ثانی	،،	اسحاق وغیرہ	یعنی برہان، حنین نے بعض اجزا سریانی میں ترجمہ کیے اور متی نے اس ترجمہ کی عربی کی، یحییٰ نحوی و ابو یحییٰ مروزی نے اصل کتاب پر نکتہ چینیاں کی ہیں، متی کندی، فارابی نے شرحیں لکھیں۔
طوبیقا		یحییٰ بن عدی	یعنی جدل، اسحٰق نے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ بن عدی نے اس ترجمہ کی عربی کی، دمشقی نے بھی سات مقالوں کا ترجمہ کیا اور ابراہیم بن عبداللہ نے آٹھ مقالوں کا، یحییٰ بن عدی نے اس کی جو تفسیر لکھی وہ ہزار ورق میں ہے، فارابی، متی نے شرحیں لکھیں، اسکندر و، ابلینوس نے جو شرحیں اس پر لکھیں ہیں ان کا ترجمہ اسحٰق نے عربی میں کیا۔
سوفسطیقا	ارسطو	ابن ناعمہ وغیرہ	یعنی مغالطہ، ابن ناعمہ وابو بشر متی نے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			بن عدی وقوبری وابراہیم نے عربی میں نقل کیا اور شرح لکھی، کندی کی بھی اس پر شرح ہے۔
ریطوریقا	،،	اسحٰق وابراہیم	یعنی خطابیات، فارابی نے شرح لکھی جو سوورق میں ہے۔
انوطیقا	،،	ابوبشر متی، یحییٰ بن عدی	یعنی شعر، کندی نے اس کومختصر کیا۔
سماع طبعی مشہور بہ سمع الکیان	،،		یہ کتاب آٹھ مقالوں میں ہے، مقالہ اولیٰ کی تفسیر اسکندر افرودسی نے کی، جس کا ترجمہ ابوالروح صابی نے عربی میں کیا اور یحییٰ بن عدی نے اس کی اصلاح کی، دوسرا مقالہ حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ نے اس کو عربی میں نقل کیا، تیسرا مقالہ موجود نہیں ہے، چوتھے مقالہ کی تفسیر اسکندر افرودسی نے تین مقالوں میں کی ہے جن میں سے دو مقالے کامل اور تیسرے کا کچھ حصہ قسطا بن لوقا نے ترجمہ کیا، قسطا نے پانچویں اور ساتویں مقالے کا ترجمہ کیا اور

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			آٹھویں کی شرح لکھی، فرفوریوس یونانی نے اس کے چار مقالوں کی جوشرح لکھی ہے، اس کا ترجمہ بسیل نے کیا اور ابوالبشر متی نے دوبارہ نقل کیا، ثامسطیوس نے بھی اس پر شرح لکھی ہے، جس کا ترجمہ متی نے سریانی میں کیا، ابواحمد نے مقالۂ اولیٰ و چہارم کی شرح لکھی، ثابت بن قرہ نے مقالہ اولیٰ وثانیہ پر حاشیہ لکھا، ابراہیم بن الصلت نے مقالہ اولیٰ کی شرح کی ابوالفرج بن قدامہ نے رومی زبان میں جوشرح لکھی ہے، عربی زبان میں اس کا بھی ترجمہ ہوا، اس کتاب پر علمائے اسلام نے بہت سی شرحیں اور حاشیے لکھے۔
سماع عالم	ارسطو	یحیٰی بن عدی وغیرہ	چار مقالوں میں ہے، ابن بطریق، متی نے اس کے بعض حصے ترجمے کیے، حنین بن اسحٰق نے اس کے سولہ مسئلوں پر گفتگو کی ہے، ابوزید بلخی نے ابوجعفر خازن کے لیے اس کی شرح لکھی، ابوہاشم نے

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			اصل کتاب پر ردوقدح کیا اور اعتراضات لکھے جو تصفح کے نام سے مشہور ہیں۔
کتاب الکون والفساد	ارسطو	حنین وغیرہ	حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا اور اسحٰق ودمشقی نے عربی میں، اسکندر نے اس کی شرح لکھی ہے، جس کا ترجمہ متیٰ نے کیا اور ابوزکریا، یحیٰی بن عدی نے اس کی اصلاح کی، یحیٰی نحوی نے بھی اس کی شرح لکھی، مقالۂ اولیٰ کا ترجمہ قسطا نے بھی کیا، لایندروس یونانی نے جو شرح لکھی ہے، اس کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کیا گیا۔
کتاب فی الآثار العلویۃ	،،	یحیٰی بن بطریق وغیرہ	لایندروس یونانی نے اس کی شرح لکھی ہے، جس کو ابوبشر متی نے عربی میں نقل کیا، اسکندر افرودوسی کی بھی شرح ہے، جس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا، ثامسطیوس کی شرح کا ترجمہ اسحٰق نے عربی میں کیا، یحیٰی بن عدی وحنین وغیرہ نے بھی اصل کتاب کے ترجمے سریانی وعبرانی میں کیے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب الحیوان	،،	ابن بطریق	۱۹ مقالوں میں ہے، نیقولاؤس نے اس کو مختصر کیا ہے جس کا ترجمہ ابوعلی بن ذرہ نے عربی میں کیا۔

تقی الدین سپہر نے ناسخ التواریخ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ارسطو کی کتابوں میں سے کتاب اثالوجیاو کتاب زبرجد و کتاب الیاقوت میری نظر سے گذریں۔

اقلیدس

حجاج ابن یوسف کوفی نے دو ترجمے کیے، پہلا ہارونی کے لقب سے مشہور ہے اور دوسرا اماموئی کے نام سے، مگر یہ دوسرا ترجمہ عمدہ اور صحیح ہونے کی وجہ سے زیادہ شایع ہوا، حجاج کے نسخے میں کل شکلیں ۴۶۸ ہیں مگر ثابت کے نسخے میں ۱۰ شکلیں اور زیادہ ہیں، کچھ مقالے ابوعثمان دمشقی نے بھی ترجمے کیے، عبداللطیف طبیب نے جو رومی نسخہ دیکھا، اس میں چالیس شکلیں اور زائد تھیں جن کا اس نے ترجمہ کرنا چاہا تھا، علمائے اسلام نے نہایت کثرت سے اقلیدس پر شرحیں اور حاشی لکھے مثلاً یزیدی، جوہری، ہامانی، ابوحفص الحرث الخراسانی، ابوالوفاء البوزجانی، ابوالقاسم انطاکی، احمد بن محمد الکرابیسی، ابویوسف الرازی، قاضی ابومحمد عبدالباقی البغدادی المشہور بہ قاضی بیمارستان (ہسپتال)، ابوعلی الحسن بن الحسین بن الہیثم البصری، ابوجعفر خازن اہوازی ابوداؤد، سلیمان بن عقبہ، محقق طوسی، ہامانی نے صرف پانچویں مقالے کا ترجمہ کیا اور ابویوسف رازی نے صرف دسویں مقالہ کا، قاضی عبدالباقی کی شرح نہایت بسیط ہے، اس نے اشکال کی مثالیں عدد سے بھی دی ہیں، ابن ہیثم نے اس کے مصادرات کی شرح لکھی اور ایک کتاب اس پر اعتراض و جواب کی لکھی، ابوجعفر خازن و اہوازی کی

شرح صرف دسویں مقالے پر ہے، ثابت بن قرہ نے ان علل کی تشریح کی جن پر اقلیدس نے شکلوں کی ترتیب رکھی ہے، اس کتاب کی بہت سی اصلاحیں بھی ہوئیں جن کوتحریر کالقب ملا مثلاً تحریر تقی الدین، اس تحریر کا نام تہذیب الاصول ہے اور تحریر محقق طوسی جونہایت عمدہ تر اور شایع ہے اور اسی وجہ سے بہت سے علماء نے اس پر حواشی لکھے جن میں سے علامہ سید شریف قاضی زادہ رومی نامور ہیں۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
المعطیات	اقلیدس	اسحٰق	اسحٰق نے عربی میں ترجمہ کیا، ثابت نے اصلاح کی، علامہ طوسی نے تحریر کی، ۹۵ شکلوں میں ہے۔
المناظر	،،	،،	۶۴ شکلوں میں ہے، علامہ طوسی نے اس کی تحریر کی۔
ظاہرات الفلک	،،	،،	۲۳ شکلیں ہیں، نصیرالدین طوسی نے تحریر کی، تبریزی نے اس کی شرح لکھی۔
کناش	ہرون القیس	ماسرجویہ	یہ حکیم ماسرجویہ بصرہ کا رہنے والا اور یہودی المذہب تھا، مروان کے زمانے میں (غالباً اس کی فرمایش سے) یہ ترجمہ اس نے عربی میں کیا۔
کتاب الجبرو المقابلہ	ایوقسطیوس	،،	محمد بن محمد یحییٰ ابن ابی البقاء البوز جانی نے جو ۳۴۸ھ میں موجود تھا اس کتاب کی تفسیر کی۔ (مختصر)

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
المطالع	السبقلاوس	قسطا بن لوقا بعلبکی	کندی نے اصلاح کی اور علامہ طوسی نے تحریر کی، ۳ مقدمے اور دو شکلوں پر مشتمل ہے۔
المنی	افلاطون	،،	موفق الدین بغدادی نے اس کو مختصر کیا اور ترتیب دی۔
الفلاحۃ الرومیہ	قسطوس بن اسکور السکینہ	سرحس بن ہلیا	اس نے پہلا ترجمہ رومی سے عربی زبان میں کیا پھر قسطا بن لوقا بعلبکی، ابوزکریا بن یحییٰ بن عدی اسطاس نے عربی میں الگ الگ ترجمے کیے، فارسی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا، جس کا نام ورزنامہ ہے،
الکرۃ المتحرکہ	اوطولوقس	ثابت	ثابت نے اصلاح کی اور محقق طوسی نے تحریر کی، ایک مقالہ اور بارہ شکلیں ہیں۔
کتاب اللیل والنہار	ثاودسیوس		دو مقالے ہیں اور ۳۳ شکلیں، علامہ طوسی نے تحریر کی۔
کتاب المساکن(۱)	،،	قسطا بن لوقا	۱۲ شکلیں ہیں علامہ طوسی نے تحریر کی
کتاب الحشائش	ویسقوریدس	اصطفن بن بسیل	اس کتاب میں نباتات کی تصویریں یونانی قدیم حرفوں میں بنی ہوئی تھیں۔

(۱) اس کتاب کا ترجمہ میں نے خود دیکھا ہے۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب السموم	باربوقا نبطی من اہل بروسایہ	ابوبکر احمد	یہ کتاب نبطی زبان میں تھی، ابوبکر احمد بن علی المعروف بابن وحشیہ نے عربی میں ترجمہ کیا۔
کتاب الادویہ	دیسقوریدس		۵ مقالے ہیں، ابن بیطار شیخ عبداللہ بن احمد مالقی نے اس کی تفسیر کی۔
کتاب تسطیح الکرہ	بطلیموس جالینوس		ابوجعفر احمد بن محمد الطیب المتوفی ۳۶۰ھ نے اس کی شرح لکھی، جو کہ رجب ۳۴۲ھ میں تمام ہوئی
کتاب القوی الطبیعہ	جالینوس	حنین بن اسحٰق	۳ مقالوں میں ہے۔
کتاب الحمیات	،،		ابوجعفر احمد بن محمد الطیب نے اس پر شرح لکھی۔
کتاب الکرۃ والاسطوانۃ	ارشمیدس مصری		ثابت بن قرہ نے اصلاح کی مگر چونکہ اصل ترجمہ خراب تھا اصلاح میں بھی بعض مصادرات چھوٹ گئے اور طوقیولس عسقلانی نے اس کے مشکلات کی شرح لکھی جس کا ترجمہ عربی میں اسحٰق بن حنین نے کیا، علامہ طوسی نے اس کی تحریر کی، ثابت کے نسخے میں

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			اس کی ۴۸ شکلیں ہیں اور اسحٰق کے نسخے میں صرف ۴۳
الماخوذات	,,	ثابت قرہ	ابوالحسن علی ابن احمد النسوی نے اس کی تفسیر کی، ۱۵ شکلیں ہیں، علامہ طوسی نے اصلاح کی، ابوسہل نے بھی کچھ اس کی اصلاح کی، جس کا نام تزئین کتاب ارشمیدس ہے۔
المخروطات فی احوال الخطوط المنحنیہ	ابلینوس النجار	احمد بن موسیٰ الحمصی ثابت بن قرہ	مامون رشید نے روم سے جو کتابیں منگوا کر ترجمہ کرائیں ان میں اس کا بھی ترجمہ ہوا، یہ سات مقالوں میں تھی مگر مقدمے کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اصل کتاب آٹھ مقالوں میں ہے اور اس آٹھ مقالہ میں سب پہلے مقالوں کے مطالب مع فوائد دیگر موجود ہیں، لیکن آٹھویں مقالے کا باوجود تلاش کے پتہ نہ لگا، ابوموسیٰ شاکر کا بیان ہے کہ اب جس قدر یہ کتاب موجود ہے، اس میں سات مقالے اور کچھ حصہ آٹھویں کا موجود ہے، جس میں کہ صرف

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			چار شکلیں ہیں، چار پہلے مقالوں کا ترجمہ احمد بن موسیٰ نے کیا اور تین پچھلے مقالوں کا ثابت بن قرہ نے جس کو کہ حسن و احمد (دونوں ابن موسیٰ بن شاکر) نے اصلاح کر کے درست کیا، اہلِ یورپ نے اس کتاب کو صرف مشرقی ترجموں کے ذریعہ سے پایا کیوں کہ اس کی اصل بالکل جاتی رہی۔ (گبن رومن امپائر)
نسبۃ الجذور	ابلینوس النجار		دو مقالوں میں ہے، پہلے مقالے کے ترجمہ کی تو ثابت نے اصلاح کی، مگر دوسرے مقالے کا ترجمہ بے معنی ہے۔
مابعد الطبیعۃ	ثاوفردیطوس	یحییٰ بن عدی	یہ مصنف ارسطو کا برادرزادہ تھا، اصل کتاب سریانی میں تھی ۔ (مختصر الدول)
کتاب الحس والمحسوس	،،	ابراہیم بن بکوین	(از مختصر الدول)
اسباب النبات	ثاوفرد یطوس	،،	(مختصر الدول)

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب من حمل فلسفۃ ارسطو	نیقلاوس	حنین	حنین نے پوری کتاب کا ترجمہ سریانی میں کیا۔ (مختصر الدول)
ثالوجیا	برقلس	ابوعثمان دمشقی	
الحدود	ارسطیقوس یونانی	ابوالوفا	ابوالوفا محمد بن محمد محاسب نے ترجمہ کیا اور اصلاح کی پھر اس پر شرح لکھی جس میں دلائل ہندسی قائم کیے۔

مجسطی

اس کتاب کے ۳ ترجمے نہایت مقبول اور مشہور ہوئے، پہلا حجاج بن مطر کا، دوسرا اسحٰق کا، جس کو ثابت نے صحیح کیا، تیسرا خود ثابت کا، اول اس کا ترجمہ یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے کیا گیا، جس کی بہت سے لوگوں نے تعلیقات اور تفسیریں لکھیں مگر وہ سب ترجمے اور تفسیریں مبہم اور مجمل تھیں، ابوحسان وسلمان نے جن کو بیت الحکمۃ کا اہتمام سپرد تھا ان ترجموں کی خوب توضیح وتصحیح کی، چونکہ مامون رشید کو اس کتاب کے ساتھ نہایت شیفتگی تھی، تو اس کی فرمایش سے حنین بن اسحٰق نے بھی ترجمہ کیا اور حجاج بن یوسف وثابت بن قرہ نے زوائد سے پاک کر کے خلاصہ لکھا، ابوالریحان بیرونی نے اس کا اختصار کیا اور عمرو بن فرخان وابراہیم بن الصلت وفضل بن حاتم وشمس الدین سمرقندی، نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری ودیگر علما نے شرحیں لکھیں، شیخ یحییٰ بن محمد بن ابی الشکر المغربی الاندلسی نے مجسطی کا ملخص ملطیہ کے پوپ ابوالفرج غریفورس بن ہارون کے اشارے سے لکھا۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
فصول بقراط	بقراط	ابوعثمان سعید ابن یعقوب	یہ مترجم نہایت نامور حکیم اور مقتدر باللہ کے وزیر کا خاص طبیب تھا۔
نموذار فی الاعمار و اسرار الموالید والقرآنات الکبیر والقرآنات الصغیر	کنکہ ہندی	،،	یہ حکیم ہندوستان کا رہنے والا ہارون الرشید کے دربار میں داخل تھا اور علاوہ طبابت کے ترجمے کا کام بھی اس کے متعلق تھا، الفنسٹن نے تاریخ ہند میں اس کا نام منکا لکھا ہے۔
کتاب حساب العدد			یہ کتاب سنسکرت زبان میں تھی جس کی توضیح وتفسیر ابوجعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے کی۔ (جامع القصص العربیہ)
رسالۃ السر فی الکیمیا	ہرمس بودشیر قسطانس بن ارامسیس		یہ رسالہ اخمیم مصر میں ایک قبہ میں پایا گیا، اس قبہ میں ایک عورت کی ممی تھی اور اس کے بال پاؤں تک لٹک رہے تھے، سات نہایت عمدہ حلے اس کے بدن پر تھے اور اس کے اردگرد چند تخت تھے جن پر چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے ممیاں تھیں، یہ رسالہ سونے کی تختی پر لکھا ہوا تھا اور اس عورت کے سر

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کلیلہ دمنہ		عبداللہ بن المقفع	کے نیچے تھا، مامون الرشید جب مصر گیا تو اس نے اس رسالہ کا ترجمہ کرایا جس کو ایک حمیر کے شخص نے کیا تھا۔ یہ کتاب ہندی زبان سے نوشیرواں کے لیے ترجمہ کی گئی پھر اس فارسی کا ترجمہ عبداللہ بن المقفع نے عربی میں کیا جو کہ ابوجعفر منصور کا منشی تھا، دوسرا ترجمہ عربی میں عبداللہ بن ہلال اہوازی نے یحییٰ بن خالد برمکی کے لیے کیا جو کہ ۱۶۵ھ میں تمام ہوا پھر سہل بن نوبخت حکیم نے یحییٰ بن خالد کے لیے نظم کیا، جس کا صلہ اس کو ایک ہزار دینار ملا کلیلہ دمنہ کے ڈھنگ پر سہل بن ہارون نے ایک کتاب مامون الرشید کے لیے لکھی جس میں ہر ایک باب و فصل کلیلہ دمنہ کے معارضے کے طور پر لکھی۔
کتاب الادویہ	ویقوریدس		عبداللہ مالقی نے اس کی شرح لکھی

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب سبرک ہندی	سبرک ہندی	عبداللہ بن علی	پہلے اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں ہوا، پھر عبداللہ بن علی نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔
کتاب الطلوع والغروب	اوطولوقس		ثابت بن قرہ نے اصلاح کی اور محقق طوسی نے تحریر، دو مقالے ہیں اور ۳۶ شکلیں۔
کتاب السموم	شاناق ہندی	ابوحاتم بلخی	یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے منکہ ہندی نے باعانت ابوحاتم بلخی فارسی میں ترجمہ کیا پھر مامون الرشید کے حکم سے علی بن العباس بن احمد نے عربی میں نقل کیا۔
الاکر المتحرکہ	اوطوقولس		مامون الرشید کے عہد میں ترجمہ ہوا اور یعقوب کندی نے اصلاح کی
اکر	ثاوذوسیوس	قسطا بن لوقا	یہ کتاب تین مقالوں میں ہے، ثابت بن قرہ نے اصلاح کی اور محقق طوسی وتقی الدین الراصد نے تحریر کی۔
اکر	مانالاوس		اس کتاب کے بہت سے ترجمے ہوئے۔ مہانی و ابوالفضل احمد بن سعید ہروی نے اصلاح کی، اس میں تین مقالے ہیں۔

یہ فہرست زیادہ تر کشف الظنون سے مرتب کی گئی ہے، خاص ارسطو کی تصانیف کے متعلق کسی قدر زائد تفصیل تاریخ التواریخ جلد اول حالاتِ ارسطو سے لی گئی ہے۔

ریمارک

یہ فہرست نہایت مختصر ہے، ہم نے خود اختصار کی غرض سے بہت سے ترجموں کے نام نہیں لکھے، گو عام طور پر ان مفصل واقعات سے لوگ بہت کم واقف ہیں، تاہم ترجموں کی اجمالی پرفخر تاریخ آج قوم کے ایک ایک ممبر کو معلوم ہے، انھیں واقعات پر خیال کرنے سے بانیان سین ٹیفک سوسائٹی علی گڈھ کو دھوکا ہوا اور وہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے مورثوں نے بذریعہ ترجموں کے علوم کو ترقی دی ہم بھی یورپ کے علوم وفنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کر کے اپنے علوم اور اپنی قوم کو ترقی کے رتبے پر پہنچا ئیں گے مگر ان کا یہ قیاس غلط اور قیاس مع الفارق تھا، اول تو ترجموں کا اہتمام اور لاکھوں روپے کا خرچ جو خلفاے عباسیہ کے زمانے میں ہوا اب غیر ممکن ہے، دوسرے اس زمانے میں علوم محدود تھے اور ترقی رک چکی تھی، جس قدر کتابیں ترجمہ کر لی گئیں یونانیوں کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا، اس زمانہ میں نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے نہ ان کتابوں کے شمار کی کوئی حد ہے، جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے، تیسرے بڑی غلطی اس قیاس میں یہ تھی کہ اس زمانے میں عربی زبان جس میں ترجمے ہوئے تمام ممالک اسلامی میں حکومت کرنے والی زبان تھی، دنیا میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ قوم نے اس زبان میں علوم وفنون کو ترقی دی ہو جو ان پر حکومت کرنے والی نہیں ہے، مگر ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہے کہ خود سید احمد خان صاحب نے جو سین ٹیفک سوسائٹی کے بانی ہیں متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے۔

☆☆☆

مدرسے اور دارالعلوم

اگرچہ ۴۳۰ھ کے متصل ہی تمام ممالک اسلامی میں درس وتدریس کا ایک عظیم الشان سلسلہ قایم ہوگیا اور انھیں دو تین صدیوں میں جس درجے کے سیکڑوں ہزاروں مجتہد، فقیہ، ادیب، شاعر، فلاسفر، مورخ پیدا ہو گئے، زمانے کو نو سو برس کی وسیع مدت میں بھی اس پایہ کے لوگ نصیب نہیں ہوئے لیکن تعجب ہے کہ تاریخ کے صفحوں میں چوتھی صدی کے اخیر تک بھی کسی کالج یا اسکول کا نشان نہیں ملتا، مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علما کے معمولی مکانات، یہی اس وقت کے مدرسے یا دارالعلوم تھے، چیمبرس انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ "مامون الرشید کے زمانہ میں عمدہ عمدہ مدرسے بغداد، بصرہ، کوفہ، بخارا میں قایم ہوئے (۱)"، اس سے بھی زیادہ واضح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی شہادت ہے کہ "مامون نے اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں خراسان میں ایک کالج بنوایا جس میں مختلف ملکوں سے نہایت لایق لایق استاد بلاکر مقرر کیے اور میسوع ایک بڑے فاضل کو جو دمشق کا رہنے والا اور مذہباً عیسائی تھا، کالج کا پرنسپل مقرر کیا" (۲)، اگر یہ روایتیں صحیح ہوں تو مدرسوں کی ابتدائی تاریخ، تصنیفات کے عہد سے بہت قریب ہو جاتی ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ایشیا کا وسیع النظر مورخ ان شہادتوں کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھے گا اور یہ کہہ کر ٹال دے گا کہ "اپنے گھر کا حال ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔"

---

(۱) کتاب مذکور ذکر عرب (۲) کتاب مذکور حالات مامون الرشید

عام خیال تو یہ ہے اور تعجب ہے کہ علامہ ابن خلکان بھی اس سے متفق ہیں کہ ''اسلامی دنیا میں اول جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی وہ دولت سلجوقیہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا''۔ اولیت کی تعیین تو ہم بھی نہیں کر سکتے مگر یہ بتا سکتے ہیں کہ نظام الملک سے پہلے علمی عمارتوں کے آثار موجود تھے، ۴۰۰ھ میں حاکم مصر نے مصر میں ایک بڑا مدرسہ بنوایا، بہت سی کتابیں اس پر وقف کیں اور فقہا و محدثین درس و تدریس کے لیے مقرر کیے۔(۱)

سلطان محمود غزنوی نے بھی ہندوستان کی بے انتہا دولت کا ایک حصہ اس عمدہ کام میں صرف کیا، متھرا کی فتح سے واپس جا کر قریباً ۴۱۰ھ میں خاص دارالسلطنت غزنین میں ایک نہایت عالیشان مدرسہ بنوایا، ایک کتب خانہ بھی اس میں شامل تھا، جس میں مختلف زبانوں کی کتابیں نہایت کثرت سے جمع کی گئی تھی، مدرسہ کے مصارف کے لیے بہت سے دیہات اور مواضع وقف کیے تھے، محمد قاسم فرشتہ کا بیان ہے کہ اس عمدہ نظیر کی تقلید تمام ارکان دولت اور امرا نے بھی کی اور تھوڑے ہی دنوں میں غزنین علمی یادگاروں سے معمور ہو گیا (۲)، دارالسلام بغداد اس فخر کے لیے ہنوز نظام الملک کا انتظار کر رہا تھا لیکن نیشا پور میں بڑے بڑے کالج و اسکول قایم ہو چکے تھے، سلطان محمود کے بھائی امیر نصر نے ایک مدرسہ بنوایا جو سعیدیہ کے نام سے مشہور ہوا، مدرسہ بیہقیہ کے مدرس اعظم ابوالقاسم اسکاف اسفراینی تھے۔

امام الحرمین نے جو امام غزالی کے استاد ہیں اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی، استاد ابوبکر فورک کو لوگوں نے خطوط بھیج کر بلایا اور جب وہ تشریف لائے تو خاص ان کے درس کے لیے ایک مدرسہ تعمیر ہوا، جس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اسلام میں اگر کوئی مدرسہ عام قومی چندہ سے بنا تو شاید یہی تھا، استاد ابوبکر نے ۴۰۶ھ میں وفات

(۱) حسن المحاضرۃ علامہ سیوطی ذکر حوادث غریبہ مصر ۴۰۰ھ و تاریخ کامل واقعات ۴۰۰ھ
(۲) تاریخ فرشتہ فتح متھرا

پائی، ان کی تصنیفات کا اندازہ سو کے قریب کیا گیا ہے، اسی طرح ایک اور مشہور مدرسہ علامہ ابواسحٰق اسفرایني المتوفی ۴۱۸ھ کے لیے قایم ہوا(۱)، حکیم ناصر خسرو سفر کرتا ہوا ۴۴۳ ہجری میں جب نیشاپور پہنچا تو اس نے ایک مدرسہ دیکھا جو طغرل بیگ سلجوقی کے حکم سے تعمیر ہو رہا تھا (۲)، ایک اور مدرسہ تھا جو ابوسعد اسماعیل استر آبادی کی طرف منسوب ہے۔

اور شاید سب سے اخیر وہ مدرسہ تھا جو نظام الملک کی علمی فیاضی کا پہلا دیباچہ تھا، یہ مدرسہ بھی نظامیہ کے نام سے مشہور تھا لیکن جب بغداد کا مشہور دارالعلوم قایم ہوا تو اس کی علمی شہرت دب گئی اور اب اگر اس کو نظامیہ کہتے ہیں تو ساتھ ہی نیشاپور کی قید لگانی پڑتی ہے، تاہم اس کا یہ فخر کوئی نہیں گھٹا سکتا کہ امام غزالی کے استاد علامہ ابوالمعالی، امام الحرمین اس کے مدرس اعظم تھے اور امام غزالی سے فخر روزگار اسی مدرسہ کے ایک مستعد طالب العلم تھے (۳)، حقیقت یہ ہے کہ نظامیہ کی عزت کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ دنیا میں سب سے پہلا مدرسہ تھا بلکہ اس لیے ہے کہ اسکی عالمگیر شہرت نے تمام پچھلی یادگاروں کو اس طرح دلوں سے بھلا دیا کہ گویا اس سے پہلے کوئی دارالعلم بنا ہی نہ تھا، خود بغداد میں بھی تو اس سے کچھ پہلے الپ ارسلان سلجوقی کا ایک مدرسہ موجود تھا جو زر خطیر کے صرف سے تیار ہوا تھا مگر آج کتنے آدمی ہیں جو اس کا نام بھی بتا سکیں۔

عرب کے سوا اسلامی ممالک میں جتنے خاندان فرماں روا ہوئے، ان سب میں پر عظمت اور قوی تر آل سلجوق تھے، الپ ارسلان و ملک شاہ جن کی شہرت نے

---

(۱) اس مدرسہ اور مدرسہ بیہقیہ و مدرسہ سعیدیہ کے لیے دیکھو حسن المحاضرہ علامہ سیوطی "ذکر امہات مدارس" باقی مدرسوں کے حالات ابن خلکان میں ان علما کے تراجم میں ملیں گے جن کے لیے وہ قایم کیے گئے، ابن خلکان میں امام الحرمین کے حالات بھی دیکھو۔

(۲) سفرنامہ ناصر خسرو مطبوعۂ دہلی ص ۳۴ (۳) دیکھو ابن خلکان ترجمہ امام الحرمین و امام غزالی

یورپ وایشیا دونوں پر برابر قبضہ کیا ہے، اسی خاندان کے یادگار تھے اور نظام الملک طوسی جس کے مبارک ہاتھوں نے نظامیہ بغداد کی بنیاد ڈالی انھیں دو کے دربار میں وزیر اعظم تھا(۱)، وہ صرف وزیر نہ تھا بلکہ سفید وسیاہ کا مالک تھا، اسنے چھ لاکھ دینار کی رقم خاص اس فیاضانہ کام کے لیے خزانۂ شاہی سے مقرر کی تھی اور تمام عملداری میں مکتب اور مدرسے قایم کیے تھے، خاص اپنی کل جاگیرات میں سے بھی دسواں حصہ مدرسوں کے لیے وقف کر دیا تھا(۲)، لیکن سب سے بڑا کام جو اس کے ہاتھوں سے پورا ہوا نظامیہ کی تعمیر تھی، گبن صاحب اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''ایک سلطان کے وزیر نے بغداد میں مدرسہ قایم کرنے کے لیے دو لاکھ دینار وقف کیے(۳) اور پندرہ ہزار دینار سالانہ اس کے صرف کے لیے مقرر کیے، نتائج علمی سے چھ ہزار ہر درجہ کے طلبا مختلف وقتوں میں بہرہ اندوز ہوئے، ان میں امرا کے لڑکے بھی تھے اور اہل حرفہ کے بھی، غریب طالب علموں کے لیے کافی آمدنی مقرر تھی اور مدرسوں اور محققوں کی تنخواہیں بیش قرار تھیں''۔

۴۵۷ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۱۰/ ذیقعدہ روز شنبہ ۴۵۹ھ کو بڑی شان وشوکت سے کھولا گیا، اگر مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ ''رسمِ افتتاح کے وقت سارا بغداد امنڈ آیا تھا اور دارالخلافہ کی کل عظمت اور قوت نظامیہ کے ہال میں مجتمع تھی''، تو قوم کے علمی جوش اور سلسلۂ عمارت کی وسعت کا بھی ہم صحیح اندازہ کر سکتے ہیں،

(۱) ملک شاہ کی سلطنت کاشغر سے بیت المقدس تک طول میں اور قسطنطنیہ سے بلادخزر تک عرض میں پھیلی ہوئی تھی، اس عہد میں گویا وہ تمام ممالک اسلامی کا مالک تھا، ۴۴۷ھ میں پیدا ہوا اور ۴۸۵ھ میں وفات پائی، نظام الملک نے بیس برس تک اس کے دربار میں وزارت کی، ابن خلکان ترجمہ ملک شاہ و نظام الملک (۲) آثارالبلاد علامہ قزوینی ذکر طوس وروضتین فی اخبار الدولتین

(۳) دینار کم از کم پانچ روپیہ کا ہوتا ہے، اگر اسی شرح سے حساب لگائیں تو بھی دس لاکھ روپیہ ہوتے ہیں۔

علامہ ابواسحٰق شیرازی جوان ممالک میں استادکل تسلیم کیے جاتے تھے، مدرس اعظم منتخب ہوئے لیکن انھوں نے ایک شبہ کی بناپر اس عہدہ کو ناپسند کیا، اس لیے سردست ابونصر مصنف شامل کو یہ خدمت سپرد ہوئی اور بیس دن کے بعد علامہ ابواسحٰق بڑے اصرار سے اس منصب کے قبول کرنے پر راضی کیے گئے، نظامیہ کی عمر میں خدانے بڑی برکت دی اور جب تک بغداد کی حکومت قایم رہی، اس کی فیاضیاں بھی دوردراز ملکوں تک اپنا اثر پہنچاتی رہیں، ہمارے مخدوم سعدی شیرازی اس کے اخیرزمانہ کے طالب العلم ہیں(۱)، امام غزالی، امام طبری، ابن الخطیب، تبریزی شارحِ حماسہ، ابوالحسن فصیحی شاگردامام عبدالقاہر جیلانی وغیرہ، مدرس اعظم اورامام احمدغزالی، ابوالمعالی قطب الدین شافعی، کیاہراسی وغیرہ وقتاًفوقتاًاس میں نائب مدرس رہ چکے ہیں، ہرزمانے میں علما کے لیے نظامیہ کی پروفیسری سے بڑھ کرکوئی بات اعزاز کی نہیں ہوسکتی تھی اور دوسو برس کی مدت میں کوئی ایسا شخص اس منصب پرنہیں مقرر ہوا جو اپنے زمانے میں یکتائے فن ویگانۂ دہرنہ سمجھا جاتا ہو، نظامیہ کے احاطہ میں ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جوخود نظام الملک کے عہد میں تیار ہوا تھا، علامہ ابوزکریا تبریزی جو ایک مشہور مصنف عالم تھے، کتب خانہ کے منتظم تھے۔(آثارالبلاد قزوینی ذکرشہرتبریز)

۵۸۹ھ میں ناصرلدین اللہ خلیفہ عباسی کے حکم سے ایک اور کتب خانہ اس کے احاطے میں تعمیر ہوااور ہزاروں نایاب کتابیں شاہی کتب خانہ سے اس کے لیے عنایت ہوئیں(۲)، نظامیہ کی مخصوص فیاضیوں میں یہ بات بھی شمار کی گئی ہے کہ اس نے طلبا کے لیے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کیں جس کا اس سے پہلے شاید کبھی رواج نہیں

(۱) نظامیہ کے یہ حالات کامل بن الاثیر واقعات ۴۵۷و۴۵۹ واعلام تاریخ مکہ مطبوعہ جرمن ۱۸۵۷ء صفحہ ۵۷ وتاریخ الخلفا سیوطی حالات ۴۵۹ھ وتاریخ ابن خلکان ترجمہ ابواسحٰق شیرازی و ابونصرصباغ وگبن صاحب کی رومن امپائرحصہ مسلمانان آغاز دولت عباسیہ وحسن المحاضرہ علامہ سیوطی ذکرمدارس مصرمیں اجمالاً وتفصیلاً مل سکتے ہیں۔ (۲) کامل ابن الاثیر واقعات ۸۹ھ

تھا(۱)، نظام الملک نے عام مدرسوں کے علاوہ نیشاپور، ہرات، موصل، اصفہان میں جو بڑے بڑے کالج قایم کیے تھے وہ بھی نظامیہ کہلاتے تھے اور مدت تک نہایت مشہور فایق علما ان کے پروفیسر مقرر ہوتے رہے مثلاً نظامیہ ہرات کے مدرس ابوسعد محمد بن یحییٰ شاگرد امام غزالی تھے، نظامیہ موصل میں ابوحامد محی الدین التوفی ۵۴۴ھ نے درس دیا، ارجانی التوفی ۵۴۴ھ نے نظامیۂ اصفہان میں تحصیل کی لیکن نظامیہ بغداد گویا یونی ورسٹی تھی اور یہ تمام کالج اس کی شاخیں تھیں۔

نظام الملک نے جو صرف کثیر مدارس وغیرہ کے لیے شاہی خزانہ سے مقرر کیا تھا اس پر ملک شاہ کو بھی خیال ہوا اور اس نے نظام الملک کو بلا کر اپنے معمولی طریقے کے موافق کہا کہ ''پیارے باپ اس قدر زرکثیر سے تو ایک فوج مرتب ہوسکتی ہے، جن لوگوں پر آپ یہ فیاضیاں کررہے ہیں ان سے ایسا بڑا کام کیا نکل سکتا ہے''، نظام الملک نے کہا: ''جان پدر! میں تو بوڑھا ہوں لیکن تم جو ایک نوجوان ترک ہو، اگر بازار میں بیچنے کے لیے کھڑے کیے جاؤ تو امید نہیں کہ تیس دینار سے زیادہ تمہاری قیمت اٹھے، اس پر خدا نے تم کو اتنا ملک عنایت کیا، کیا اس کا اتنا شکریہ بھی تم ادا نہیں کرسکتے، تمہاری فوج کے تیر چند قدم پر کام دے سکتے ہیں، لیکن میں جو فوج تیار کررہا ہوں اس کی دعاؤں کے تیر آسمان کی سپر سے بھی نہیں رک سکتے''، ملک شاہ بے ساختہ بول اٹھا کہ ''مرحبا پیارے باپ ایسی فوجیں جس قدر ممکن ہوں اور تیار کرنی چاہئیں۔''(۲)

مسلمانوں کی علمی تاریخ میں یہ بات بھی نہایت عجیب اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ماوراء النہر کے علما کو نظامیہ کے قایم ہونے کے تمام حالات سے اطلاع ہوئی تو سب نے ایک مجلس ماتم منعقد کی اور اس بات پر رو ئے کہ ''اب علم علم کے لیے نہیں، بلکہ جاہ وثروت حاصل کرنے کے لیے سیکھا جائے گا''، اس روایت سے آیندہ

(۱) حسن المحاضرہ بحوالہ طبقات سبکی، فصل امہات المدارس (۲) اعلام تاریخ مکہ ذکر مدرسہ نظامیہ

ہم کو ایک راے قایم کرنے میں مدد ملے گی، نظامیہ نے اپنے اثر سے ایک عجیب گرمجوشی تمام ملک میں پیدا کردی، وہ پانچویں صدی میں قایم ہوا اور چھٹی صدی تک اسلامی دنیا کا کوئی کونہ (بجز اسپین کے) علمی عمارتوں سے خالی نہ رہا، خراسان کے بڑے بڑے صوبے مثلاً مرو، نیشاپور، ہرات، بلخ اور ایران کے علاقے، گو پہلے سے علم وفضل کے مرکز تھے، مگر نظامیہ کے اثر نے اور بھی مالا مال کردیا، یاقوت حموی قریباً چھٹی صدی میں جب مرو پہنچا تو وہاں بہت سے مدرسے اور کتب خانے موجود پائے، جن مدرسوں کے متعلق بڑے بڑے کتب خانے تھے ان کے یہ نام ہیں، مستوفیہ، شرف الملک ابوسعد محمد بن منصور المتوفی ۴۹۴ھ کا قایم کیا ہوا، عمید یہ خاتونیہ اس میں چند کتب خانے تھے، نظامیہ نظام الملک حسن بن اسحٰق کا قایم کیا ہوا۔

یاقوت حموی، معجم البلدان (۱) جیسی عجیب اور جامع کتاب انھیں کتب خانوں کی مدد سے لکھ سکا (۲)، خاص شہر نیشاپور کی کثرت مدارس کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۵۵۶ھ میں جب اندرونی فسادات نے اس کو غارت کیا تو عام عمارتوں کے ساتھ ۲۵ حنفیہ اور شافعیہ مدرسے بھی برباد ہوئے، ان کے علاوہ بارہ کتب خانے بھی جل گئے یا لوٹ لیے گئے، یزد میں صرف علامہ حسین بن احمد ابوالفضل المتوفی ۵۹۱ھ کے اہتمام میں بارہ مدرسے تھے جن میں بارہ سو طلبہ تعلیم پاتے تھے (۳)، خوارزم کا بڑا کالج امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ کی پروفیسری سے ممتاز تھا، مسٹر شارڈن سیاح فرانس جنھوں نے دولت صفویہ کے زمانہ میں ایران کے اکثر مقامات کی سیر کی، اپنے سفر نامہ میں لکھتے ہیں کہ "سلیمان صفویہ کے عہد میں خاص شہر اصفہان میں اڑتالیس مدرسے موجود تھے"۔ (مرأت البلدان ناصری جلد اول

---

(۱) یہ عربی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب ہے، جو کم وبیش چار ہزار صفحوں میں ہے اور اس جامعیت سے لکھی گئی ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے، یورپ میں چھاپی گئی ہے۔ (۲) دیکھو معجم البلدان حالات مرو (۳) حسن المحاضرہ جلد اول صفحہ ۲۶۴ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ

صفحہ ۵۴ مطبوعۂ ایران)

خود بغداد میں نظامیہ کے ہوتے تیس بڑے بڑے کالج موجود تھے، جن کے بلند ایوانات اور وسعتِ عمارت کی نسبت علامہ ابن جبیر کا بیان ہے کہ "ہر ایک بجائے خود ایک مستقل شہر معلوم ہوتا ہے" (سفر نامہ علامہ بن جبیر حالات بغداد بمقام لیڈن ۱۸۵۲ء میں چھاپا گیا ہے۔)، علامۂ موصوف نے ۵۷۸ھ میں بغداد کو دیکھا تھا، بغداد کے بعض مدرسوں کا ہم ایک مختصر سا نقشہ فہرست کے طور پر درج کرتے ہیں:

مدرسہ	بانی	کیفیت
مدرسہ تاجیہ	تاج الملک مستوفی السلطان	غالباً ۴۸۲ھ میں تعمیر ہوا، امام ابوبکر شاشی مدرس اعظم مقرر ہوئے۔ (کامل بن الاثیر واقعات ۴۸۲ھ)
مدرسہ مستوفیہ	شرف الملک ابوسعد محمد بن منصور	یہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا مستوفی تھا، ۴۹۴ھ میں وفات پائی، یہ مدرسہ باب الطاق کے پاس تھا۔ (کامل واقعات ۴۹۴ھ)
مدرسۂ کمالیہ	کمال الدین ابوالفتوح	صاحب المخزن تھا، یہ مدرسہ ۵۳۵ھ میں تیار ہوا، رسم افتتاح میں بغداد کے تمام اعیان شریک تھے۔ (کامل واقعات ۵۳۵ھ)
مدرسہ ابوالمظفر	ابوالمظفر عون الدین	۵۴۴ھ میں خلیفہ المقتفی بامر اللہ کے دربار میں منصبِ وزارت پر ممتاز ہوا (ابن خلکان حالات وزیر مذکور)

مدرسہ	بانی	کیفیت
مدرسہ ثقۃ الدولہ	علی بن محمد معروف بہ ثقۃ الدولہ	خلیفہ المقتفی کا مقرب تھا، یہ مدرسہ شافعیوں کے لیے خاص تھا، دجلہ کے کنارے پر اس کی عمارت تھی، ثقۃ الدولہ نے ۵۹۴ھ میں وفات کی (ابن خلکان ترجمہ شہدۃ فخر النساء)
مدرسہ بہائیہ		نظامیہ کے متصل ہے، ابومنصور محمد ہروی جن کی عظمت و شان ان کے حالات کے پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے، قریباً ۵۶۷ھ میں پروفیسر مقرر ہوئے، مدرسۂ نظامیہ میں بھی وعظ کہا کرتے تھے، نظامیہ کی پروفیسری کے لیے بھی امیدوار کیے گئے تھے۔ (ابن خلکان حالات ابومنصور مذکور)
مدرسہ فخریہ	فخر الدولہ	ان کا باپ وزیر تھا، فخر الدولہ نے ۵۷۸ھ میں وفات پائی۔ (کامل بن الاثیر واقعات ۵۷۸ھ)
مدرسۂ والدہ ناصر لدین اللہ	خلیفہ ناصر لدین اللہ کی والدہ	
مستنصریہ	خلیفہ المستنصر باللہ	اس مدرسہ کا کسی قدر تفصیلی حال ہم لکھتے ہیں، ان مدرسوں کے علاوہ بغداد میں مشہد ابی حنیفہ، وقفیہ،

کیفیت	بانی	مدرسہ
زیرکیہ، معنیہ، عنائیہ، مدرسۂ قدیمہ، عباسیہ شہرت عام رکھتے تھے، طبقات الحنفیہ وغیرہ میں ان کے مدرسین وغیرہ کے حالات مل سکتے ہیں، بغداد کے اکثر مدرسے بغداد کے تباہ ہونے کے بعد بھی قایم رہے۔		

دولت عباسیہ کی تاریخ میں یہ بات بڑے الزام کے قابل تھی کہ ان تمام علمی عمارتوں میں سے ایک بھی کسی عباسی خلیفہ کے نام سے نہ تھی اور دارالخلافہ بغداد اس خاص حیثیت سے بالکل دوسری نسلوں کا ممنون تھا، خلیفہ مستنصر باللہ نے جو رجب ۶۲۳ھ میں تخت نشین ہوا، اس الزام کو اٹھانا چاہا، اتنی مدت کی غلطی کا کفارہ بھی اسی مقدار سے ہونا چاہیے تھا اور انصاف یہ ہے کہ ایسا ہی ہوا، باتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ جس عظمت وشان کا یہ مدرسہ بنا اس کی نظیر سے گذشتہ اور موجودہ دونوں زمانے خالی ہیں، ۶۲۵ھ میں دجلہ کے کنارے اس کی بنیاد کا مبارک پتھر رکھا گیا اور چھ برس کی مدت میں سلسلۂ عمارات پورا تیار ہوا، عمارت کا ایک حصہ عین دجلہ میں تھا (مستنصریہ کے آثار اب بھی موجود ہیں، ناصر الدین بادشاہِ حال ایران نے سفرنامۂ ایشیا میں اس کی گذشتہ شوکت یاد دلانے والی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ذکر کیا ہے) اسی سنہ میں ماہ رجب جمعرات کے دن اس کی رسمِ افتتاح بڑی شوکت وشان سے ادا ہوئی، جس میں بغداد کے تمام اعیان وافسران، فوج وعلما، مدرسین وقضاۃ واہل منصب شریک تھے، مستنصر نے تمام اعیان وامرا کو خلعتیں عنایت کیں اور مویدالدین علقمی جس کے اہتمام میں عمارت تیار ہوئی تھی اس کی جاگیر مضاعف کردی، مذاہب اربعہ کے فقہا اور شیخ الحدیث، شیخ النحو، شیخ الفرائض، شیخ الطب درس کے لیے مقرر ہوئے، ایک سو ساٹھ

اونٹ پر لاد کر عمدہ عمدہ کتابیں کتب خانۂ شاہی سے اس کے استعمال کے لیے آئیں، مدرسہ ہی کے احاطہ میں ایک ہسپتال اور مزبلہ بھی تھا (جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے ہیں)، دوسواڑتالیس مستعد طلبا مدرسہ کھلنے کے ساتھ بورڈنگ میں داخل ہوئے، جن کو مکان، فرش، خوراک، روغن، کاغذ، قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا، ان کے دسترخوان پر معمولی کھانے کے علاوہ شیرینی اور میوے بھی چنے جاتے تھے، ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار الگ وظیفہ کے طور پر مقرر تھی، سیکڑوں دیہات اور موضع مدرسہ کے سالانہ مصارف کے لیے وقف تھے، جن کی مجموعی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا یعنی آج کل کے حساب سے تقریباً ساڑھے چار لاکھ سالانہ تھی (۱) (علامہ ذہبی نے تاریخ دول الاسلام میں ان مواضع کی پوری فہرست دی ہے)، حنفیوں کے مدرس اعظم شیخ عمر ملقب بہ رشید الدین فرغانی تھے جو فقہ، اصول، حکمۃ، کلام میں بڑے ماہر گنے جاتے تھے، پہلے سنجار کے مدرسہ میں مدرس تھے پھر مستنصر باللہ نے فرمان بھیج کر بلالیا تھا (۲)، مدرسے کے دروازے پر ایک ایوان تھا جس میں ایک نہایت عجیب اور بیش قیمت گھڑی رکھی تھی (۳) جس کو علی بن تغلب بن ابی الضیا بعلبکی ایک مشہور

---

(۱) دیکھو تاریخ الخلفا سیوطی، حالات مستنصر باللہ واعلام تاریخ مکہ صفحہ ۱۷۴ و مرأت البلدان ناصری مطبوعہ ایران جلد اول صفحہ ۲۴۴ و دول الاسلام علامہ ذہبی و جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ ترجمہ عمر بن محمد بن الحسین بن ابی عمر بن محمد ابوحفص، فرغانی مدرس اول مستنصریہ جواہر مضیہ میں مدرسین شافعیہ و مالکیہ و حنبلیہ کے نام بھی لکھے ہیں۔ (۲) آثار البلاد قزوینی ذکر شہر فرغانہ (۳) شاید یہ دوسری گھڑی ہے جو دولت عباسیہ کے عہد میں تیار ہوئی، اس سے بہت پہلے ہارون الرشید نے جو گھڑی شاہ فرانس کو بھیجی تھی، یورپ میں وہ تعجب کی نگاہ سے دیکھی گئی، فرانس کے مورخوں کا بیان ہے کہ ہمارے ملک میں پہلے گھڑی وہ ظاہر ہوئی جو ہارون الرشید نے ۸۰۷ء میں شارل میں بادشاہ فرانس کو تحفہ کے طور پر بھیجی تھی، یہ گھڑی ایسی عجیب وغریب تھی کہ تمام دربار فرانس حیرت میں رہ گیا، اس گھڑی میں بارہ دروازے (بقیہ صفحۂ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیں)

ہیئت داں و منجم نے تیار کیا تھا(۱) جو بعد کو الساعاتی یعنی گھڑی ساز کے نام سے مشہور ہوا، عبدالرزاق بن الغوطی جو محقق طوسی کا شاگرد رشید تھا اور دس برس تک مراغۃ کی رصدگاہ میں محقق صاحب کے ساتھ خزانۃ الرصد کا مہتمم رہ چکا تھا، واقعۂ تتار کے بعد کتب خانے کا افسر مقرر رہوا، جہاں رہ کر اس نے تاریخ کی ایک کتاب ۵۰ جلدوں میں لکھی۔(۲)

چھٹی صدی میں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، ممالک اسلامیہ کا کوئی حصہ علمی یادگاروں سے خالی نہ رہا، عرب اور مصر بھی جہاں اب تک اس قسم کی ایک عمارت بھی موجود نہ تھی، اس صدی میں کالج اور اسکولوں سے معمور ہو گئے، مصر میں خلیفہ عبیدی حاکم بامراللہ نے ۴۰۰ھ میں جو دارالعلم قایم کیا تھا، ۴۰۳ھ میں خود اس کو برباد کر دیا اور اس وقت سے پھر کسی نے اس طرح توجہ نہیں کی، چھٹی صدی میں دو خاندان نوریہ و صلاحیہ اسلامی عظمت و شوکت کی اصلی مرکز تھے، نورالدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ میں تخت نشین ہوا، دولت نوریہ کا بانی اور مصر و شام کا مستقل فرماں رواں تھا، اس نے قریباً پچاس شہر و قلعے یورپ کے پنجۂ غصب سے واپس لیے تھے، صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ نے نورالدین ہی کے دامنِ فیض میں تربیت پائی تھی، لیکن کروسیڈ کی لڑائیوں اور خصوصاً بیت المقدس کی فتح نے اس کو اپنے آقا سے بھی زیادہ

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) تھے، جب گھنٹہ پورا ہوتا تھا تو ایک دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا اور ایک مونگری جو تانبے کی بنی ہوئی تھی وہ جرس پر پڑتی تھی، یہ دروازے کھلے رہتے تھے اور جب ایک دورہ پورا ہو جاتا تھا تو دروازوں سے بارہ سوار نکلتے تھے اور گھڑی کی پیشانی پر چکر لگاتے تھے (دیکھو کشف الخبا عن فنون اور بامطبوعۂ جوائب ۱۲۹۹ھ ص ۲۱۸ و ۲۱۹) ایک انگریزی تصنیف میں بھی قریب قریب یہی تفصیل مذکور ہے۔ (۱) دیکھو جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ ترجمہ احمد بن علی بن تغلب بن ابی الضیا المذکور، کسی قدر اس گھڑی کے حالات آثار البلاد علامہ قزوینی میں بذیل عجائبات بغداد ملیں گے۔ (۲) دیکھو تتمہ ابن خلکان ترجمہ ابن الغوطی

شہرت اور عزت دی، یہ دونوں خاندان صرف اسی بات میں نام آور نہ تھے کہ انھوں نے مسلمانوں کی بھولی ہوئی عظمت ایک باراور یورپ کو یاد دلا دی بلکہ اس بات میں بھی کہ ان کی وجہ سے ممالک مصروشام میں علم کا آوازہ نہایت بلند ہوگیا۔

نورالدین نے حلب، حماۃ، حمص، بعلبک، منبج، رحبہ میں بڑے بڑے مدرسے قایم کیے، خاص دمشق میں، جواس کا پایہ تخت تھا، ایک ایسا عظیم الشان مدرسہ بنایا کہ مدت تک بے نظیر خیال کیا جاتا تھا، یہ فخر بھی خاص نورالدین کی قسمت میں تھا کہ تمام دنیا میں جو پہلا دارالحدیث قایم ہوا اس کے نام سے ہوا، ورنہ اس سے پہلے خاص علم حدیث کے درس کے لیے کوئی مدرسہ نہیں تعمیر ہوا تھا(۱) علامہ ابن جبیر نے ۵۷۸ھ میں جب دمشق کو دیکھا تو خاص شہر میں ۲۰ کالج تھے، عام حکم تھا کہ جوشخص کوئی مدرسہ قایم کرے اس کو تمام مصارف خزانہ شاہی سے ملیں گے، مغربی طلبا کے لیے خاصۃً سات باغ اور کچھ زمین وقف تھی، جس کی سالانہ آمدنی پانسو اشرفیاں تھیں، جولڑکے قرآن ختم نہیں کر سکتے تھے ان کو صرف سورہ کوثر سے اخیر تک پڑھایا جاتا تھا، ان میں سے پانسو لڑکوں کا وظیفہ خزانہ شاہی سے مقرر تھا(۲)، نورالدین نے خاص اپنے ذاتی مال سے مدارس اور مکاتب وغیرہ پر جو جاگیریں وقف کی تھیں اور جو اس کی وفات کے بعد بھی سیکڑوں برس تک قایم رہیں ان کی آمدنی نو ہزار صوریہ اشرفیاں تھیں۔(۳)

اسی طرح سلطان صلاح الدین نے اسکندریہ، قاہرہ، بیت المقدس، دمشق وغیرہ میں مدرسے قایم کیے اور بے انتہا آمدنی ان پر وقف کی(۴) علامہ ابن جبیر لکھتے

(۱) ابن خلکان ترجمہ نورالدین وحسن المحاضرہ ذکر مدرسہ کاملیہ (۲) یہ تمام حالات سفرنامہ علامہ ابن جبیر دمشق کے ذکر میں ملیں گے۔ (۳) روضتین فی اخبارالدولتین مطبوعہ مصر ۱۲۸۷ھ جلد اول ص ۱۰، روضتین کے مصنف نے ایک عہدہ دار سے جوان جاگیروں سے تعلق رکھتا تھا، ۶۰۸ھ میں یہ تعداد تحقیق کی تھی۔ (۴) ابن خلکان ترجمہ صلاح الدین

ہیں کہ اسکندریہ کے بورڈنگ میں اذن عام تھا کہ جو شخص کہیں سے بطلب علم آئے اس کو مکان، خوراک، حمام، ہسپتال سب کچھ سلطنت کی طرف سے مہیا ملے گا(۱)، صلاح الدین کے عہد میں علما کی جو تنخواہیں مقرر تھیں ان کی تعداد تین لاکھ دینار سالانہ تھی، جس کے آج کل کے حساب سے کم از کم پندرہ لاکھ روپئے ہوتے ہیں۔ (روضتین فی اخبار الدولتین جلد ثانی، ص ۱۳۸ مطبوعۂ مصر)

صلاح الدین کا تمام خاندان اس قسم کی فیاضیوں میں نامور تھا، عموماً امرا اور اعیانِ دولت بلکہ خواتین میں بھی یہ جوش پھیل گیا تھا اور یہ بات نہایت ذلت کی سمجھی جاتی تھی کہ کوئی دولت مند شخص مرے اور دنیا میں کوئی علمی یادگار نہ چھوڑ جائے۔

سلطان صلاح الدین کا نامور فرزند الملک الظاہر ابوالفتح غازی، جس زمانہ میں حلب کا فرماں روا تھا، قاضی ابوالمحاسن بہاء الدین شافعی جو مدرسۂ نظامیہ میں نائب رہ چکے تھے اور نہایت مشہور فاضل تھے، ۵۹۱ھ میں اس کی خدمت میں باریاب ہوئے حلب میں اگرچہ اس وقت بھی چند مدرسے موجود تھے(۲)، لیکن قاضی صاحب نے ان کو کافی نہیں سمجھا اور الملک الظاہر سے کہہ کر بہت سی جاگیریں خاص ان مصارف کے لیے مقرر کرائیں، خود بھی دو مدرسے، شافعیہ و دارالحدیث قایم کیے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اس وقت سے حلب کی علمی شہرت نہایت عام ہوگئی اور دور دراز ملکوں سے اہل علم نے وہاں آنا شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں حلب بھی دمشق و مصر کی طرح علوم وفنون کا مرکز بن گیا۔(۳)

---

(۱) سفر نامہ ابن جبیر ص ۳۸ (۲) ۵۷۸ھ میں جب علامہ ابن جبیر نے حلب کو دیکھا تو وہاں چند مدرسے موجود تھے، جن میں سے ایک مدرسہ نہایت عالیشان اور عمارت کی خوبی میں وہاں کے مشہور جامع مسجد کا ہمسر تھا، اس کے بورڈنگ اور عام مکانات پر انگور کی بیلیں چڑھادی تھیں اور طالب العلم اپنی جگہ سے بے ملے انگور کھا سکتے تھے۔(سفر نامہ ابن جبیر، ذکر حلب)

(۳) ابن خلکان ترجمہ قاضی صاحب موصوف

اس زمانہ میں مصر، قاہرہ، دمشق، حلب، اربل کے تمام علاقوں میں جو بے انتہا مدارس قایم ہو گئے ان کو کون شمار کر سکتا ہے، اگر کوئی شخص چاہے تو جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ وحسن المحاضرہ فی تاریخ مصر وقاہرہ، وفیات الوفیات وابن خلکان وغیرہ سے ایک بڑی فہرست تیار کر سکتا ہے، لیکن ہم اس موقع پر صرف ان بڑے بڑے مدرسوں کا ایک نقشہ دیتے ہیں جو خاصۂ صلاحیہ، نوریہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، بعض مدرسین کے بھی ہم نام لکھیں گے جس سے معلوم ہوگا کہ جو علما اس زمانہ میں علم وفضل کے مامن تھے اکثر انھیں مدرسوں کے منصبِ درس پر ممتاز تھے۔

دولت صلاحیہ

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شافعیہ یا صلاحیہ	صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ	مصر	علامہ نجم الدین حبوشانی بمشاہرۂ ۔ دینار مدرس اعظم اور مہتمم مقرر ہوئے اور دس مدرس ان کے ماتحت تھے، تقی الدین بن دقیق العید، سراج بلقینی، حافظ ابن حجر، بہاء الدین قاضی القضاۃ وغیرہ وقتاً فوقتاً اس میں مدرس مقرر رہوئے، نہایت کثیر آمدنی اس پر وقف تھی، علامہ ابن جبیر لکھتے ہیں کہ اس کی سلسلۂ عمارات پر ایک مستقل آبادی کا گمان ہوتا ہے۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شافعیہ	،،	،،	شاید مصر میں صلاح الدین نے پہلا مدرسہ ۵۶۶ھ میں یہی قایم کیا (روضتین جلد اول ص ۱۹۱)
مالکیہ یا قمحیہ	،،	،،	محرم ۵۶۶ھ میں قایم ہوا، قریباً ۷۸۴ھ میں علامہ ابن خلدون نے بھی اس میں درس دیا (تاریخ ابن خلدون حالات مصنف، روضتین فی اخبار الدولتین)
زین التجار (یا) شریفیہ	صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ	مصر	عماد الدین عباسی، سراج الدین بلقینی (استاذ جلال الدین سیوطی) تقی الدین قاضی القضاۃ وغیرہم اس میں درس دیتے تھے۔
مشہد	،،	قاہرہ	یہ مدرسہ صلاح الدین کے نام سے مشہور نہیں ہے۔ (ابن خلکان، حالات صلاح الدین)
سوفیہ	،،	،،	حنفیون کے لیے خاص تھا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
صلاحیہ	,,	بیت المقدس	اس کے مدرسین کی تنخواہیں بیش قرار تھیں (انس الجلیل تاریخ بیت المقدس)
صلاحیہ	,,	دمشق	
افعنلیہ	الملک الافضل بن صلاح الدین	بیت المقدس	مالکیہ کے لیے خاص تھا۔
ظاہریہ	الملک الظاہر بن صلاح الدین	حلب	ابوالحسن سیاح مدرس اعظم تھے
عزیزیہ	الملک العزیز بن صلاح الدین	دمشق	نہایت مشہور اور عظیم الشان مدرسہ تھا، علامہ سیف الدین آمدی المتوفی ۶۳۱ھ مدرس اعظم تھے۔
اسدیہ	اسدالدین شیرکوہ عم صلاح الدین	حلب	علامہ ابن الصلاح کے والد مدرس اعظم تھے۔
ستیہ (یا) زمردیہ	زمرد ہمشیرہ صلاح الدین	دمشق	زمرد اور اس کے شوہر اور بھائی کی قبریں اسی مدرسہ میں ہیں
منازل الغز (یا) تقویہ	الملک المظفر تقی الدین المتوفی ۵۸۷ھ برادرزادہ صلاح الدین	مصر	جزیرۂ روضہ کا کل خراج وحمام الذہب کی آمدنی اس پر وقف تھی (روضتین جلد اول ص ۱۹۱) شافعیوں کے لیے خاص تھا، ۵۶۶ھ میں قایم ہوا تھا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
مالکیہ	،،	،،	مالکیوں کے لیے خاص تھا۔
تقویہ	،،	رہا	
عذرائیہ	عذرا صلاح الدین کی بھتیجی تھی۔	دمشق	
دارالحدیث	الملک الاشرف برادرزادہ صلاح الدین	،،	علامہ ابن الصلاح المتوفی ۶۴۳ھ مدرس اعظم تھے، علامہ ابن خلکان نے ایک برس تک ان کی خدمت میں تحصیل علم کی۔
معظمیہ	الملک المعظم برادرزادہ صلاح الدین	،،	الملک المعظم اور ان کے اکثر عزیز اسی مدرسہ میں مدفون ہیں ملک المعظم تصنیف اور فن ادب وفقہ میں نامور تھا، اس نے عام حکم دیا تھا کہ جس کو زمخشری کی مفصل زبانی یاد ہو سو اشرفیاں اس کو انعام دی جاویں، اس تقریب سے اکثروں نے یہ مفید کتاب حفظ کر لی تھی۔
معظمیہ	الملک المعظم برادرزادہ صلاح الدین	بیت المقدس	اس مدرسہ پر بہت سے دیہات ومواضع وقف تھے، ۶۲۰ھ میں قایم ہوا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
دارالحدیث الکاملیہ	الملک الکامل برادرزادہ صلاح الدین المتوفی ۶۳۵ھ	قاہرہ	یہ دوسرا دارالحدیث ہے، جو ممالک اسلامی میں دارالحدیث نوریہ کے بعد قایم ہوا، حافظ ابن دحیہ، زکی الدین منذری قطب قسطلانی، ابن دقیق العبد، ابن سید الناس ، حافظ زین الدین عراقی استاد حافظ ابن حجر، وقتاً فوقتاً اس کے مدرس مقرر ہوئے، یہ سب علما اپنے زمانہ میں بے مثل خیال کیے گئے ہیں۔
صالحیہ	الملک الصالح نجم الدین ایوب بن الملک الکامل	،،	یہ مدرسہ چار مدرسوں پر مشتمل تھا، مقریزی کا بیان ہے کہ وہ قاہرہ کے نامور اور عظیم الشان مدرسوں میں گنا جاتا ہے، جب وہ کھولا گیا تو شعرا نے قصائد و قطعے لکھے، حسن المحاضرہ میں چند اشعار نقل کیے ہیں، ۶۳۹ھ میں قایم ہوا۔
معینیہ	معین الدین خسر سلطان صلاح الدین	دمشق	

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شبلیہ	شبل الدولہ	،،	نہایت مشہور مدرسہ ہے، شبل الدولہ زمرد خاتون (ہمشیرہ صلاح الدین) کا غلام تھا۔
عزیۃ	عزالدین ایبک	،،	عزالدین الملک المعظم کا غلام اور صرخد کا حاکم تھا، یہ مدرسہ میدان اخضر میں واقع ہے۔
شہابیہ	شہاب الدین طغربل	حلب	الملک العزیز اسی مدرسہ میں مدفون ہے۔
مجیریہ	مجیرالدین	قاہرہ	مجیرالدین مشہور عالم اور سلطان صلاح الدین کا وزیر تھا، یہ مدرسہ درب ملوخیہ کے پاس ہے، محرم ۸۰ھ میں قایم ہوا۔
بہائیۃ	ابوالمحاسن یوسف بہاء الدین	حلب	علامہ ابن خلکان اسی مدرسہ کی بورڈنگ میں مدت تک رہے ہیں اور علوم کی تحصیل کی ہے،
دارالحدیث	،،	،،	
فاضلیہ	قاضی فاضل المتوفی ۵۹۶ھ	قاہرہ	قاہرہ کا مشہور مدرسہ ہے، قاضی فاضل سلطان صلاح الدین کے دربار کا منشی اور نہایت نامور شخص تھا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	
فلکیۃ	فلک الدین برادر الملک العادل	دمشق	

خاندان نوریہ

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
نوریہ حنفیہ	نورالدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ	دمشق	نورالدین کی تربت اسی مدرسہ میں ہے، عرقلۃ ایک شاعر نے اسی مدرسہ کی شان میں لکھا ہے، دمشق فی المداین بیت ملک وہذی فی المدارس بیت ملک (روضتین)
دارالحدیث نوریہ	،،	،،	ممالک اسلامی حدیث کے درس کے لیے پہلا مدرسہ یہی تعمیر ہوا۔
نوریہ شافعیہ	،،	،،	یہ مدرسہ خاص شافعیوں کے لیے بڑی عظمت وشان سے تعمیر ہونا شروع ہوا مگر تیار ہونے سے پہلے نورالدین نے وفات کی، پھر الملک العادل برادر صلاح الدین کے اہتمام سے اتمام کو پہنچا،

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			حافظ ابوشامہ لکھتے ہیں کہ تمام مدارس میں اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے، حافظ مذکور نے کتاب الروضتین اسی مدرسہ میں رہ کر لکھی ہے۔
نوریہ	،،	حلب	قطب الدین شافعی جو مدرسہ نظامیہ بغداد میں نائب مدرس رہ چکے تھے، اس مدرسہ کے مدرس اعظم مقرر ہوئے (ابن خلکان ترجمہ قطب الدین)
عمادیۃ	نورالدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ	حلب	نورالدین نے ۵۶۷ھ میں عماد کاتب کو اس کا مہتمم اور افسر مقرر کیا، اس وجہ سے یہ مدرسہ اُنہیں کے نام سے مشہور ہوگیا، ۵۶۹ھ میں نورالدین نے عماد کاتب کے پاس مدرسہ کے دروازہ پر میناکاری اور سنہری کام بنوانے کے لیے یاقوت وغیرہ اور سونا بھجوایا (روضتین)

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
عزیۃ	عزالدین نبیرۂ نورالدین المتوفی ۵۸۹ھ	موصل	یہ مدرسہ ایوان شاہی کے مقابل واقع ہے، شافعیہ وحنفیہ دونوں فرقوں کے لیے تھا عمدہ اور مشہور مدرسہ ہے، عزالدین کی قبر بھی اسی کے احاطہ میں ہے (ابن خلکان وروضتین)
سیفیہ عتیقیہ	سیف الدین غازی برادر نورالدین المتوفی ۵۴۴ھ	،،	عالیشان اور مشہور مدرسہ ہے، سیف الدین اسی کے احاطہ میں مدفون تھے، حنفیہ وشافعیہ کے لیے تھا۔
ارسلانیہ	ارسلان نورالدین شاہ ابن عزالدین مذکور	موصل	عزالدین کے مدرسہ کے سامنے ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ حسن وخوبی میں یہ مدرسہ لاجواب کہا جا سکتا ہے
مدرسۃ الملک القاہر	الملک القاہر ابن نورالدین ارسلان شاہ المتوفی ۶۱۵ھ	دمشق	نورالدین نے مساجد کے اوقاف کا انتظام ان کے متعلق کیا تھا اور ان کے ایما سے بہت سے مدرسے بنوائے۔
قایمازیہ	ابومنصور قایماز	موصل	ابومنصور، سیف الدین غازی کی طرف سے موصل کا حاکم تھا، علامہ ابن اثیر مصنف مثل

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			السائراسی کے دربار میں منشی تھے، ۵۵۹ھ میں قایم ہوا۔
قائمازیہ	،،	اربل	اس مدرسہ پر بہت سے مواضع وقف تھے۔
زینیہ	زین الدین علی المتوفی ۵۶۳ھ	،،	ابومنصور قایماز انھیں کا آزاد کردہ غلام تھا، زین الدین نے موصل اور بغداد میں بھی مدرسے بنوائے تھے (روضتین)
مجاہدیہ	امیر مجاہدالدین المتوفی ۵۵۵ھ	دمشق	مجاہدالدین امرائے نورالدین میں ایک نامور شخص تھا، یہ مدرسہ باب الفرادیس کے پاس ہے (روضتین)
مجاہدیہ	،،		یہ مدرسہ نورالدین کے مدرسہ کے پہلو میں ہے (روضتین)

ان مدرسوں کے علاوہ اس زمانہ میں اور بہت سے نامور مدرسے شام ومصر میں موجود تھے، جن کا تذکرہ اکثر طبقات اور تاریخوں میں پایا جاتا ہے، دمشق میں رواحیہ، صادریہ، ریحانیہ، امینیہ، حلب میں حلاویہ، قلیجیہ، طرخانیہ، اربل میں مظفریہ، مدرسۃ القلعہ، ایسے مشہور مدرسے تھے جن کی شہرتِ عام کی وجہ سے مورخین ان کے تذکرہ میں صرف نام پر اکتفا کر جاتے ہیں۔

یہ مختصر فہرست جو ہم نے نمونہ کے طور پر پیش کی ہے، ابن خلکان، حسن المحاضرہ علامہ سیوطی، روضتین فی اخبار الدولتین، جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ، وانس

الجلیل فی تاریخ القدس والخلیل، وذیل ابن خلکان سے ماخوذ ہے لیکن یہ حالات ایسے متفرق موقعوں پر مذکور ہیں کہ خاص خاص حوالے نہیں دیے جا سکتے تھے۔

خاندانِ صلاحیہ کا سلسلہ ۶۵۲ھ میں منقطع ہو گیا اور ۹۲۳ء تک مصر و عرب کی قسمت اتراک و چراکسہ کے ہاتھ میں رہی، اتراک نے ۷۸۳ تک حکومت کی، پھر چراکسہ قابض ہوئے، یہ دونوں خاندان زرخرید غلام تھے، جو ترقی کر کے منصب حکومت تک پہنچے تھے، ان خاندانوں میں بھی حکومت خاندان کے سلسلہ سے نہیں چلتی تھی، ترک اور چرکس غلام جو فوج میں بھرتی ہونے کے لیے ہمیشہ خریدے جاتے تھے، ان میں سے اقبال نے جس کا ساتھ دیا تخت نشین ہو گیا، ان میں سے بعض بڑے جاہ و اقتدار کے حکمراں ہوئے اور علم و فن کی نہایت قدردانی کی، اس عہد میں مدرسوں کو اور بھی ترقی ہوئی، جن کے چند اسباب تھے، مدارس کے تمام اخراجات اوقاف میں داخل ہو چکے تھے اور اگر کوئی جانشینِ حکومت ان کو واپس لینا چاہتا تو گروہِ علما جن کا ملک پر بہت اثر تھا عموماً مخالف ہو جاتا جیسا کہ ایک بار ۷۸۰ھ میں واقع ہوا، یہ ترکی غلام جن کو کل تک لوگ بازاروں میں بکتے ہوئے دیکھ چکے تھے، اگر خود بھی اس قسم کی فیاضیاں نہ دکھاتے اور اہلِ علم ان کا ساتھ نہ دیتے تو ان کو تختِ حکومت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہو سکتا تھا، خاص کر حرمین میں اس خاندان نے جو علمی فیاضیاں کیں ان کی نظیر پچھلے زمانوں میں نہیں مل سکتی۔

اس عہد سے پہلے مکہ معظّمہ میں بہت کم مدرسے تھے، ۵۷۹ھ میں امیر فخر الدین زنجیلی نے مکہ معظّمہ میں ایک مدرسہ بنوایا، ۵۸۰ھ میں خلیفہ المستضی باللہ کی کنیز خاص طاب الزماں نے ایک مدرسہ قائم کیا جس میں دس فقہائے شافعی مدرس تھے، ۶۴۱ھ میں ایک اور مدرسہ تعمیر ہوا جس کا بانی الملک المنصور عمرو بن علی والی یمن تھا، مصر کے ترک بادشاہوں سے پہلے حرمین میں جو قابل اعتداد مدرسے موجود تھے، غالباً یہی دو تین تھے، لیکن ان ترکوں کے عہد سے مکہ معظّمہ بھی دوسرے شہروں کی طرح

ایک بڑا دار العلم بن گیا۔

عبدالباسط نے جو سلطان ظاہر ططر کی فوج میں ناظر تھا، مکہ معظّمہ میں تین عمدہ مدرسے بنوائے، قاہرہ، غزہ، شام میں بھی اس نے بہت سے مدرسے قائم کیے تھے۔

ملک اشرف قاتیبائی نے جو خاندان چراکسہ میں سے تھا اور ۸۷۲ھ میں تخت نشین ہوا، مکہ معظّمہ میں چاروں مذہب کے لیے نہایت عظیم الشان مدرسہ بنوایا، جس میں بہتر کمرے تھے اور بیچ میں جو نہایت وسیع کمرہ تھا اس کی چھت سنگ مرمر کی تھی اور سونے کا کام کیا ہوا تھا، قاتیبائی جب مکہ معظّمہ گیا تو فوج وحشم کے ساتھ اسی مدرسے میں ٹھہرا اور طلبا، فراش، بواب، اہل مطبخ، منیجر، خزانچی وغیرہ کی تنخواہیں مقرر کیں، قاتیبائی نے مدینہ منورہ میں بھی ایک عالیشان مدرسہ بنوایا، ابن الناصر محمد بن قلاؤن نے مصر میں جو مدرسہ قایم کیا، وہ رفعت و شان کے اعتبار سے تمام دنیا میں بےنظیر سمجھا گیا ہے، ۷۵۸ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور تین برس متصل ہر روز اس کی تعمیر میں بیس ہزار درہم صرف ہوئے، جس کی کل تعداد آج کل کے حساب سے کم و بیش چون لاکھ روپے ہوتی ہے، اس کا بڑا کمرہ جس کو پرنسپل ہال کہنا چاہیے ۶۵ گز در گز تھا۔ خود سلطان ابن الناصر بھی زمانہ تعمیر میں کثرتِ مصارف سے عاجز آ گیا تھا، مگر یہ خیال ہمیشہ غیرت دلاتا رہا کہ ''مصر کا وسیع ملک کیا ایک مدرسہ کے صرف سے بھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتا''، چاروں مذہب کے فقیہ درس کے لیے مقرر تھے، ابن الناصر نے یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ چار بڑے بڑے منارے تعمیر کیے جائیں، تین بن بھی چکے تھے مگر جب ۷۶۲ھ میں اتفاقاً ایک منارہ کے گرنے سے تین سو یتیم بچے جو مکتب السبیل میں پڑھ رہے تھے دب کر مر گئے تو یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔(۱)

اس عہد میں یہ واقعہ بھی ایک عجیب یادگار ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں میں سے بھی ایک بلند حوصلہ بادشاہ یعنی سلطان غیاث الدین نے مکہ معظّمہ میں مدرسہ

(۱) یہ پوری تفصیل حسن المحاضرہ مدرسہ سلطان حسین کے ذکر میں ہے۔

قایم کرنے کے لیے شریف مکہ کے پاس زرِ خطیر روانہ کیا، ہندوستان کا یہ پہلا بادشاہ ہے جس کے نام سے ایک مدرسہ منسوب کیا گیا ہے، ورنہ جیسا کہ ہم آگے چل کر لکھیں گے، اس سرزمین میں اس قسم کا خیال کبھی نہیں پیدا ہوا، رمضان ۸۱۳ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۸۱۴ھ میں اتمام کو پہنچی، زمین بارہ ہزار مثقال کو خریدی گئی اور مدرسے کے متعلق بہت سے ایوانات و مکانات تیار ہوئے، ۱۷محرم ۸۱۴ھ میں بڑی شوکت وشان سے کھولا گیا، ساٹھ طالب العلم اسی وقت مدرسہ میں داخل ہوئے اور سب کے لیے وظیفہ مقرر ہوا، چاروں مذہب کے مدرس مقرر ہوئے تھے اور ہر ایک کے درس کا الگ الگ وقت مقرر تھا، غیاث الدین نے اس کے سوا چار مدرسے اور وہاں قایم کیے۔(۱)

نمونے کے طور پر ہم اتراک و چراکسہ کے عہد کے چند مدرسوں کا ذکر کرتے ہیں جو خاص اسکندریہ وقاہرہ میں موجود تھے اور یوں تو بلادِ مصروشام میں سیکڑوں ہزاروں مدرسے قایم ہو چکے تھے، قاضی مجیرالدین حنبلی نے ۹۰۰ھ میں خاص شہر بیت المقدس کی جو تاریخ لکھی اس میں وہاں کے ۱۳۸ایسے مدرسوں کی فہرست مع تاریخ تعمیر واسماے بانیان درج کی ہے جو اس کے عہد میں موجود تھے، یہ تاریخ جس کا نام انس الجلیل ہے، ۱۲۸۳ھ میں بمقام مصر مطبع وہبیہ میں چھاپی گئی ہے۔

نام مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
ظاہریہ قدیمہ (۲)	۶۶۲ھ	الملک الظاہر ببرس بند	علامہ تقی الدین بن رزین للشافعیۃ	ایک کتب خانہ بھی اس پر وقف تھا الملک

(۱) حرمین شریفین کے مدرسوں کا ذکر اعلان وشفاء الغرام تاریخ مکہ میں اجمالاً وتفصیلاً لکھا ہے۔

(۲) مدرسہ عبدالباسط کے سوا اور باقی مدرسوں کا ذکر علامہ سیوطی نے اجمالاً وتفصیلاً کیا ہے، لیکن بہت سے زائد حالات میں نے تتمۂ ابن خلکان وخود حسن المحاضرہ کے مختلف مقامات سے لکھتے ہیں

نام مدرسہ	سنہ تعمیر	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
		قداری المتوفی ۶۷۶ھ	محب الدین بن عبدالرحمٰن مدرس حنفی، حافظ شرف الدین دمیاطی، مدرس حدیث، کمال الدین قرشی مدرس قرأت	الظاہر نے یورپ و تاتار پر چند بار فتحیں حاصل کیں، اس کی فتوحات اور بہت سی عالی شان تعمیرات و مصارف سلطنت کو تتمۂ ابن خلکان میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔
منصوریہ		ملک منصور قلاؤن المتوفی ۶۸۹ھ	ابوحیان برہان الدین امین الدین شاگرد ابن الہمام	یہ مدرسہ نہایت عظیم الشان تھا، علامہ کتبی مصنف تتمہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ مدرسہ اور اس میں جو ہسپتال تھا بے نظیر خیال کیے گئے ہیں، ملک منصور بڑی سطوت و جبروت کا بادشاہ تھا اور اس کے خاندان نے اکثر یورپ پر فتحیں حاصل کیں

نام مدرسہ	سنہ تعمیر	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کے نام	کیفیت
ناصریہ	۷۰۳ھ	ناصر محمد ولد قلاؤن المتوفی ۷۴۱ھ		اس میں چاروں مذہب کا درس ہوتا تھا، یہ مدرسہ نہایت پر شوکت تھا اور دروازے پر ہر وقت چوکی پہرہ رہتا تھا۔
خانقاہ بیبرسیۃ	۷۰۷ھ	امیر رکن الدین بیبرس		قاہرہ میں اس سے بڑی کوئی خانقاہ نہیں ہے، اس میں جو کٹگہرہ تھا، وہ بغداد کے ایوانِ خلافت سے نکال کر آیا تھا اور بطور یادگار فتح اس میں لگایا گیا تھا۔
خانقاہ شیخو	۷۵۷ھ	امیر کبیر سیف الدین افسر امراے جمداریہ	اکمل بن محمود بابرتی جن کا حاشیہ ہدایہ پر غنایہ کے نام سے مشہور ہے، مدرس حنفی تھے شیخ بہاالدین	علامہ سیوطی نے بہت سے مدرسین کے نام لکھے ہیں جو اس میں وقتاً فوقتاً فقہ و حدیث کے

نام مدرسہ	سنہ تعمیر	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
			بن علامہ تقی الدین سبکی مدرس شافعی، شیخ خلیل مصنف مختصر مدرس مالکی، قاضی القضاۃ موفق الدین مدرس حنبلی، جمال الدین عبداللہ بن رولی مدرس حدیث	درس کے لیے مقرر ہوئے۔
صرغتمشیہ	۷۵۷ھ	صرغتمش افسر امرائے جمداریہ	قوام اتقانی مدرس حنفی	اس کی عمارت نہایت بلند اور پرتکلف تھی۔
ظاہریہ جدیدہ	۷۸۸ھ		علاء الدین مدرس حنفی، اوحدالدین رومی مدرس شافعی شمس الدین بن تکین مدرس مالکی، صلاح بن الاعمی مدرس حنبلی، احمد زادہ عجمی مدرس حدیث، فخر الدین	۱۲؍رجب کو کھولا گیا، شعرانے اس کی شان میں قصیدے لکھے، بادشاہ نے نہایت تکلف سے ایک عام دعوت کی جس میں تمام علما وغیرہ مدعو تھے علاء الدین

نام مدرسہ	سنہ تعمیر	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
			ضریر مدرس قرأت	سیرامی مدرس حنفی جب آئے تو بادشاہ نے ان کا فرش اپنے ہاتھ سے بچھایا علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ جتنے مدرس اس میں مقرر ہوئے کوئی شخص اس زمانے میں ان کا ہم سر نہ تھا۔
مدرسہ عبدالباسط		عبدالباسط بن خلیل بن ابراہیم الدمشقی		یہ سلطان ظاہر ططر المتوفی ۸۲۴ھ کا ناظر العسا کر تھا۔
مویدیہ	۸۱۹ھ	الملک المؤید		اس کی عمارت پر چالیس ہزار اشرفیاں صرف ہوئیں
اشرفیہ	۸۲۹ھ	ملک اشرف سیف الدین ابونصر الدقماقی جس نے قبرس فتح کیا		یہ مدرسہ نہایت زر خطیر کے صرف سے تیار کرایا اور بہت سی آمدنی اس پر وقف کی (اعلام ص ۲۰۷)

اسکندریہ وقاہرہ کے یہ وہ مدرسے ہیں کہ ہر ایک کو کالج بلکہ یونی ورسٹی کہنا چاہیے، علامہ سیوطی نے ان کو (بجز اخیر مدرسہ کے) امہات مدارس میں لکھا ہے اور مصر کے اور بہت سے مدرسوں مثلاً فخریہ وفاضلیۃ، سیفیۃ، مغربیۃ، مشہد نفیسی، مدرسہ قاتیبائی، جمالیہ، دارالمامون، عاشوریہ، خشابیۃ، کہاریۃ وغیرہ کا ذکر چھوڑ دیا ہے، حالانکہ اکثر ان کے مدرسین کے نام فقہاے مصر کے ذیل میں لکھے ہیں۔

تعلیم کے سلسلۂ تاریخ میں سلاطین ترک کا زمانہ تمام پچھلے زمانوں سے زیادہ نمایاں اور تابندہ ہے، ترکی مدارس بہت سے خصوصیات میں اولیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور اس بات کا جائز حق رکھتے ہیں کہ تاریخ کے صفحوں میں تمام پچھلے مدرسوں کے سلسلے سے الگ لیکن ممتاز موقع پر جگہ لیں، گذشتہ عہدوں میں مدرسے آپس میں کوئی انتظامی تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ بعض حالتوں میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ باہمی اختلاف کی ایک تحریک دلانے والی مثال تھی، لیکن ترکی مدارس ایک انتظامی رشتہ میں منسلک تھے اور یہ کہنا چاہیے کہ ایک ہی خاندان کی اولاد تھے، پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی مدرسے تھے، اگرچہ ان میں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ترکوں کا سررشتۂ تعلیم پولیٹکل حیثیت رکھتا تھا، وہ سلطنت کے لیے لایق لایق عہدہ دار پیدا کرتا تھا، تمام مدرسے ایک یونی ورسٹی کے تابع تھے اور طلبا و مدرسین درجہ بدرجہ ترقی حاصل کرتے تھے، مدرسین کے لیے پنشن کا حق جو ترکی حکومت میں نہایت فیاضانہ طور پر قائم کیا گیا تھا، اسلامی تاریخ میں غالباً پہلی ایجاد تھی، یہ تعجب ہے کہ اکثر حالتوں میں پنشن اصل تنخواہ کے برابر ہوتی تھی، ترکوں کے عہد میں تنخواہیں بھی اکثر بیش قرار تھیں (۱) بڑے بڑے مدرسوں میں مدرس کو اکثر ساٹھ یا اسی درہم روزانہ ملتے تھے اور بعض حالتوں میں یہ تعداد سو بلکہ دو سو درہم یومیہ تک پہنچ جاتی تھی، ہم اس موقع پر تاریخ

(۱) ٹرکی کے سفر میں مجھ کو اس راے سے رجوع کرنا پڑا، درہم جس چیز کا نام ہے، اس سے مراد وہ سکہ ہے جس کو آج کل قرش کہتے ہیں اور یہ کل ۲ کا ہوتا ہے، اس حساب سے یہ تنخواہیں بیش قرار نہیں رہتیں۔

اٹومین کا کچھ انتخاب نقل کرتے ہیں۔

History of the attomana Turks, By Sir Edward Creasy, M.A. latachief justice of Oeylonedondon Richard Benlly & son

جس سے ترکی مدرسوں کی نسبت ایک معقول راے قایم کی جاسکتی ہے، یہ مورخ ترکی خاندان کے آئین ملکی اور عام انتظامات کے ذیل میں لکھتا ہے ''محمد ثانی سے، جو بادشاہ پہلے ہوئے وہ اوران میں خاص کر ارخان کو مدرسے اور کالجوں کے قیام کا از حد شوق تھا لیکن محمد ثانی ان سب سے بڑھ کر نکلا اور اس کے زمانے میں تعلیم کا بڑا چرچا ہوا اور عالم لوگ بڑے بڑے عہدے پانے لگے، قسطنطنیہ کا فاتح بخوبی جانتا تھا کہ سلطنت کے قیام اور وسعت کے لیے علاوہ جواں مردی اور قواعد دانی کے کچھ اور بھی ضروری ہے، چوں کہ وہ خود پڑھا لکھا تھا اس لیے اس نے اپنی رعایا کی تعلیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، محمد نے علاوہ ابتدائی مدرسوں کے جو مکتب کے نام سے مشہور ہیں اور ہر گاؤں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، بڑے بڑے مدرسوں کی بنیاد ڈالی، طالب العلموں کو دس مختلف مضامین میں تعلیم ہوتی تھی، صرف، نحو، منطق، تاریخ، زبان، طرزِ تحریر، علم فصاحت و بلاغت، اقلیدس، ہیئت، جو طالب العلم ان دسوں مضامین میں دستگاہ کامل حاصل کرتے تھے، دانشمند کا خطاب پاتے تھے، یہ بھی سب مضامین مثل اور مولوی فاضلوں کے چھوٹے لڑکوں کو پڑھاتے تھے، دانشمندوں کو ابتدائی مدرسوں کی اعلیٰ مدرسی ملتی تھی، لیکن جماعت علما میں داخل ہونے کے لیے ان کو بہت کچھ قانون (فقہ سے مراد ہے) پڑھنا اور متواتر امتحان دینے ہوتے تھے اور درجہ بدرجہ سند پاتے تھے، یہ تعلیم بے شبہ اسی تعلیم کے مطابق ہے، جو پندرھویں صدی میں پیرس اور کیمبرج میں دی جاتی تھی اور اس بات کا بہت خیال کیا جاتا تھا کہ علما میں صرف وہ لوگ داخل ہوں جو ذی علم اور ذی لیاقت ہوں ان لوگوں کو بڑی عزت اور فیاضانہ

مدد اور خاص حقوق ملتے تھے، اسی جماعت علما میں سے بڑے کالجوں کے اعلیٰ مدرس، قاضی، مفتی اور جج مقرر ہوتے تھے، مسجدوں کے امام اور واعظ علما کے بعد ہیں، دنیا میں بجز ترکی کے کوئی ایسا ملک نہیں جہاں علمائے مذہب ایسے ذی اختیار اور حکم شرع ایسا قوی ہو، عثمانی اس بات میں بڑے قابل عزت ہیں کہ وہ لوگ مدرسوں اور علما کی بڑی عزت کرتے ہیں جس کا نشان بھی عیسائی قوموں میں نہیں پایا جاتا۔"

ترکوں میں ارخان (بولیع ۷۲۶ھ) پہلا فرماں روا تھا جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی، اس کا ازنیق کا مدرسہ نہایت نامور ہوا، داؤد قیصری جن کی شرح فصوص الحکم مشہور ہے اور علاء الدین شارحِ وقایہ وغیرہ مدرس تھے، سلطان مراد کے زمانے میں اس کے مدرس اعظم کی تنخواہ ۱۳۰ درہم یومیہ تھی، ارخان کے جانشینوں نے اس سلسلہ کو بہت ترقی دی اور محمد خان فاتح کے عہد میں حدِ کمال کو پہنچ گیا، محمد خان نے بچپن میں عمدہ تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کا علمی شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ حکومت کے زمانے میں بھی وہ طالب العلمی کرتا رہا اور علامہ خواجہ زادہ، علامہ ابن الخطیب وغیرہ علما خاص اس کے پڑھانے پر مقرر تھے۔

محمد فاتح نے ۸۶۵ھ میں بمقام قسطنطنیہ ایک بڑی یونی ورسٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ماتحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ تھے، یہ عظیم الشان عمارت رجب ۸۷۵ھ میں تمام ہوئی، علاء الدین طوسی، خواجہ زادہ، ملا عبدالکریم، محمد بن مصطفیٰ اور بہت سے علما مدرس مقرر ہوئے جن میں سے اکثر کی تنخواہ سو درہم یومیہ تھی، محمد خان خود بھی ان مدرسوں میں درس کے وقت کبھی کبھی شریک ہوتا تھا، ایک بار علامہ علاء الدین طوسی کے درس میں حاضر ہوا، شرح عضدیہ، سید شریف کا درس ہو رہا تھا علامہ کی حسنِ تقریر سے ایسا محظوظ ہوا کہ رہ رہ کر کھڑا ہو جاتا تھا، سبق ختم ہوا تو دس ہزار درہم علامہ کو اور پانچ پانسو درہم طلبا کو صلہ دیا، علامہ علاء الدین قوشجی کو مدرسہ ایاصوفیہ کا مدرس اعظم کیا اور دو سو درہم یومیہ تنخواہ مقرر کی، علامہ قوشجی کی شرح تجرید و

خواجہ زادہ کے محاکمۂ تہافتہ الفلاسفہ امام غزالی نے شہرت عام حاصل کی ہے، یہ محاکمہ بھی محمد خان کی فرمائش سے لکھا گیا تھا، جس کے صلے میں اس نے دس ہزار درہم عنایت کیے تھے۔

بایزید خان نے جو ۸۸۶ھ میں تخت نشین ہوا، بہت سے مدرسے قائم کیے، اس زمانہ میں مدرسین کے علاوہ جتنے نامور علما تھے سب کی تنخواہیں بشرح دس ہزار عثمانی سالانہ مقرر کردیں اور جولوگ شرح مفتاح سکاکی کا درس دیتے تھے ان کی تنخواہ چار ہزار سالانہ مقرر کی، حرمین شریفین کے فقہا کے لئے چودہ ہزار اشرفی سالانہ کا حکم دیا، سلطان سلیمان نے جو ۹۲۶ھ میں سریر حکومت پر بیٹھا علاوہ اور مدارس کے ۹۷۲ھ میں مکہ معظمہ میں چار بڑے بڑے مدرسے تعمیر کرائے، قاضی مکہ نے بنیاد کا پتھر رکھا اور تمام علما نے ان کی متابعت کی، ہر مدرس کی تنخواہ اس وقت ۵۰ عثمانی یومیہ پھر سو عثمانی مقرر ہوئی، ان مدرسوں میں طب و حدیث کا بھی درس ہوتا تھا، قسطنطنیہ میں بہت سے عمدہ مدرسے بنوائے اور چھ سو طلبہ کا وظیفہ مقرر کیا (عقد المنظوم فی افاضل الروم) سلطان سلیم نے پچھلی کوششوں میں اور بہت کچھ اضافہ کیا، مراد نے جو ۹۸۲ھ میں تخت نشین ہوا، مکہ معظمہ میں بہ مقام صفا ایک مدرسہ بنوایا جس میں ایک مدرس، ایک معید اور بیس دانش مند تھے۔ (۱)

ترکوں کی علمی تاریخ کا ہم نے نہایت چھوٹا حصہ اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے، ترکوں کی حکومت کو کم وبیش آج چھ سو برس ہوئے، اس وسیع مدت میں بیسیوں سلاطین، سیکڑوں وزراء، ہزاروں اہل منصب نے نہایت حوصلہ مندی سے فیاضیاں دکھائیں، ایک مختصر سے آرٹیکل میں ان کی اجمالی صورت بھی نہیں دکھائی جاسکتی، شقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ وعقد المنظوم فی

---

(۱) ترکی مدارس کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے، آثار الدول قرمانی واعلام وشفاء الغرام ہر دو تاریخ مکہ وشقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ وعقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم سے لکھا ہے۔

ذکر افاضل الروم، ان دو تاریخوں میں ارخان کے عہد سے ۹۸۴ھ تک کے علماء مذکور ہیں، ان کے حالات میں ترکی مدارس کا ذکر بھی ضمناً آجاتا ہے، اگر کوئی چاہے تو انھیں دو کتابوں سے قریباً دوسو کالجوں اور مدرسوں کی فہرست بنا سکتا ہے، جن میں تمام علوم درسیہ پڑھائے جاتے تھے اور جن کے بانیوں، مدرسوں اور شرح تنخواہ کا حال ان تاریخوں میں کسی قدر تفصیل سے مل سکتا ہے، اس موقع پر ہم جریاً للعادۃ ایک مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں، جس میں چند بڑے بڑے نامور کالجوں کا ذکر اور ان کے اجمالی حالات ہیں۔

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ	کیفیت
مرادیہ	بروسہ	سلطان مراد بویع ۷۶۱ھ	مدرسین ۶۰ روپیہ یومیہ ۱۸۰۰ ماہوار	اسی طرح تمام مدرسین کی تنخواہیں جو لکھی ہیں یومیہ تھیں ترکوں میں تنخواہوں کا حساب یوم سے ہوتا ہے۔
سلطانیہ	،،	سلطان بایزید خان	۵۰ روپیہ	
قاسمیہ	،،	قاسم پاشا	۵۰ روپیہ	
مناستر	،،		۵۰ روپیہ	
محمدیہ	،،	سلطان محمد خان اول	۵۰ روپیہ	

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ	کیفیت
مرادیہ	قبلوچہ	سلطان مراد بن محمد خان	۶۰ روپیہ	
مرادیہ	بروسہ	،،	۵۰-۸۰ روپیہ	ملا نعمت اللہ معروف بروشنی زادہ
حلبیہ	اورنہ	،،	۵۰ روپیہ	
محمودیہ	قسطنطنیہ	محمود پاشا وزیر اعظم	۵۰ روپیہ	عرب زادہ
مرادیہ	،،	مراد پاشا	۵۰ روپیہ	
قلندریہ	،،	،،	۵۰ روپیہ	
مدرسہ ابی ایوب	،،	،،	۸۰ روپیہ	
بایزیدیہ	،،	بایزید خان	۱۰۰ روپیہ	
بایزیدیہ	اماسیہ	،،	۸۰ روپیہ	
ابراہیمیہ	قسطنطنیہ	ابراہیم پاشا	۸۰ روپیہ	
مدرسہ علی پاشا	،،	علی پاشا	۵۰ روپیہ	
مدرسہ مصطفیٰ پاشا	،،	مصطفیٰ پاشا	۵۰ روپیہ	
رستمیہ	،،	رستم پاشا وزیر کبیر	۵۰ روپیہ	شمس الدین خلف مفتی ابوالسعود مفسر مدرس تھے، یہ سترہ برس کے سن میں

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ	کیفیت
قاسمیہ	،،	قاسم پاشا	۵۰ روپیہ	اس مدرسہ کے مدرس اعظم مقرر ہوئے، ۹۰۷ھ میں وفات کی ملا محمد خلف مفتی ابوالسعود متوفی ۹۷۱ھ
سلیمانیہ	،،	سلطان سلیمان بن السلیم	۶۰ روپیہ	
سلیمانیہ	قسطنطنیہ	سلطان سلیمان بن السلیم	۶۰ روپیہ	
داؤدیہ	،،	داؤد پاشا	۵۰ روپیہ	
پیریہ	،،	پیری پاشا	۴۵ روپیہ	
سنانیہ	،،	سنان کپتچی	۵۰ روپیہ	
سلیمیہ عتیقیہ	،،	سلطان سلیم بن السلیمان	۶۰ روپیہ	
سلیمیہ جدیدیہ	،،	،،	۵۰و۶۰ روپیہ	
مدرسہ ست خاتون	،،	ست خاتون	۴۰ روپیہ	
خاصکیہ	،،	زوجۃ السلیمان خان		
مدرسہ خانقاہ	،،	،،	۵۰ روپیہ	

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ	کیفیت
مدرسہ طرابزون	طرابزون	والدۂ سلطان سلیم خان	۵۰روپیہ	ملا نعمت اللہ معروف بروشنی زادہ
دارالحدیث	قسطنطنیہ	سلطان سلیمان خان	۱۰۰روپیہ	ملا کوسج امین
مدرسہ خسرویہ	،،	امیر الامراء خسرو	۵۰روپیہ	
سلیمانیہ	دمشق	سلطان سلیمان خان	۸۰روپیہ	
مدرسہ اطنہ	اطنہ	پیری پاشا	۵۰روپیہ	
لکیوزہ		مصطفیٰ پاشا	۵۰روپیہ	
دارالحدیث	اورنہ		۲۰۰روپیہ	ملا شمس الدین قاضی زادہ مدرس تھے۔
احمدیہ	چورلے	احمد پاشا وزیر اعظم	۵۰روپیہ	ملا کوسج امین
سلیمانیہ	ازنیق	سلیمان پاشا	۵۰روپیہ	
مدرسہ لکیوزہ	لکیوزہ	مصطفیٰ پاشا		
افضلیہ	قسطنطنیہ	،،	۵۰روپیہ	

اخیر میں مجھ کو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ترکی مدارس کو جو ترجیح ہے اور جس کا میں اعتراف کر چکا ہوں، وہ زیادہ تر سلسلۂ انتظام، اصولِ ترقی، انضباطِ قواعد، کثرتِ مصارف کی رو سے ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کو باقاعدہ ملکی عہدے ملتے تھے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر پولیٹکل پلہ بھاری ہوا کمال علمی کا وزن کم ہوتا گیا، یہی بات ہے کہ چھ سو برس کی مدت میں ان مدارس سے ایسے کم لوگ اٹھے جو حکیم یا محقق کا لقب حاصل کر سکے، علامہ ابن خلدون نے تو کلیۃً نفی کی ہے،

لیکن اگر صاحبِ کشف الظنون کی فہرستِ حکما تسلیم بھی کر لی جائے تاہم اس کا اختصار ترکوں کے وسیع سلسلۂ حکومت سے موزوں نسبت نہیں پیدا کر سکے گا، حقیقت یہ ہے کہ ایشیا کی تاریخ میں کمال کو دنیوی جاہ و منصب کی خواہش سے کم تعلق رہا ہے۔

ہمارے آرٹیکل کا یہ حصہ جس میں خاص قسم کے مدارس اور دار العلوم سے بحث ہے، ختم کے قریب ہے اور صرف دو ناموں کی جگہ اس میں اور خالی ہے یعنی اندلس (اسپین) و ہندوستان، اس بات کا ہم کو بھی افسوس ہے کہ اسپین جو تیغ و قلم دونوں میں خلافتِ بغداد کا حریفِ مقابل تھا، اس خاص سلسلہ میں سب سے اخیر نمبر پر ہے، ہم قرطبہ (کارڈوا) غرناطہ (گرینڈا) کی شہرت اور عظمت کے منکر نہیں ہیں، قرطبہ کے نقشہ میں ہم ۳۸۳۷ مسجدیں، ۷۰۰ حمام، ۱۱۳۰۰۰ عام رعایا کے مکانات دیکھتے ہیں، قصر الزہراء کامل، مجدد، قصر الحائر، روضہ مبارک، قصر السرور، رشیق، تاج، بدیع (۱) کے بلند اور زیب و زینت سے معمور عمارتیں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن اس تمام وسعت میں کسی کالج یا اسکول کا ہم کو نشان نہیں ملتا، بے شبہ قرطبہ کی علمی شہرت بغداد سے کم درجہ پر نہیں ہے، بے شبہ یورپ کی استادی کا فخر اسپین ہی کا خاص حصہ ہے، لیکن اس وقت اصطلاحی مدارس سے بحث ہے، جس کے معنی اتنے ہی تک محدود ہیں کہ خاص درس و تدریس کی غرض سے کوئی عمارت تیار کی گئی ہو، اسپین کی بجا طرفداری علامہ مقری سے زیادہ کوئی شخص نہیں کر سکتا، جو اسپین کی ایک ایک خوبی کو تمام اور ممالک اسلامیہ کے سامنے اس دعوی سے پیش کرتا ہے کہ "تم ایک کا بھی جواب لا سکتے ہو" تاہم اس محقق اور وسیع النظر مورخ نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ "تمام اسپین میں ایک بھی مدرسہ نہ تھا، صرف مسجدوں کے صحن تھے جن میں تمام علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔" (۲)

---

(۱) یہ سب قرطبہ کے عالیشان ایوانات و باغات کے نام ہیں۔ (۲) دیکھو نفح الطیب تاریخ اندلس مطبوعہ فرانس جلد اول صفحہ ۱۳۶

فوسٹر صاحب کی تاریخ اسپین ونظم الممالک وچیمبرس انسائیکلوپیڈیا وغیرہ میں اسپین کے مدرسوں کا جہاں اجمالاً ذکر کیا گیا ہے، غالبًا اس سے اسی قسم کی عام درس گاہیں مراد ہیں۔

ہندوستان (۱) کے تذکرے میں ہم کو بے خطر کہنا چاہیے کہ اس سرزمین پر شاید ایک بھی علمی عمارت نہیں قایم ہوئی، لیکن اس ملک کی عام علمی فیاضیوں کا انکار نہیں ہوسکتا، اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں، عالم گیر کے خزانۂ شاہی سے عموماً ان لوگوں کے لیے جاگیریں اور وظیفے مقرر تھے جو بطور خود درس وتدریس کرتے رہتے تھے، دولت ترکیہ اس قدر بے انتہا صرف اور سعی واہتمام کے ساتھ بھی اصل نتیجہ میں دولت تیموریہ سے کچھ فائق نہیں ہے، شمس الدین، فناری، قاضی زادہ، خواجہ زادہ، علامہ قوشجی، ابن المویدوغیرہ کے مقابلہ میں جن کو صاحب کشف الظنون حکما کا لقب دیتے ہیں، ہم ملا محمود جونپوری، ملا نظام الدین، محبّ اللہ بہاری، حمد اللہ، بحر العلوم، شاہ ولی اللہ صاحب کو کسی قدر ترجیح کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں۔

جن مدرسوں کے حالات ہم لکھ آئے ہیں اکثر مذہبی یا عقلی علوم کے درس کے لیے تھے، صنعتی مدارس کے متعلق ہماری واقفیت نہایت محدود ہے، اسلامی ملکوں میں عمدہ صنعتوں کے بہت سے آثار موجود ہیں مگر ان کی تعلیم کے کسی مرتب سلسلہ کو ہم نہیں معلوم کرسکے ہیں، فنونِ جنگ میں مسلمانوں کی ترقی اب بھی دنیا کی موجودہ حالت وصورت سے عیاں ہے اور مسٹر ایڈورڈ کری صاحب نے یورپ میں ترکوں کی فتوحات کو اسی امر سے منسوب کیا ہے، لیکن ہم عبد المومن سلطان مراکو کے مدرسۂ حربیہ کے سوا اور کسی حربی تعلیم گاہ کے حالات سے نہیں واقف ہیں، چراکسہ کے عہد میں جو عمدہ فوجیں تیار ہوئیں اس کا یہ طریقہ تھا کہ ترک اور چرکس غلام جو خرید کر کے آتے

---

(۱) میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ تحقیق صحیح نہیں ثابت ہوئی، ہندوستان میں بہت سے مدارس تعمیر ہوئے تھے، گو اب ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔

تھے ان کو پہلے قرآن اور معمولی خط و کتابت اور کسی قدر حساب سکھایا جاتا تھا، پھر فقہ کی تعلیم ہوتی تھی اور بعض تیز طبع نوجوان معتد بہ لیاقت تک پہنچ جاتے تھے، اس کے بعد نیزہ بازی اور تیراندازی اور پھر شہسواری سکھائی جاتی تھی، جوان کی تعلیم کا انتہائی زینہ تھا لیکن یہ طریقہ بھی کسی باقاعدہ ہیئتِ اجتماعی کی صورت نہیں رکھتا تھا اور غالباً تمام ممالک اسلامیہ میں حربی تعلیم کا یہی انداز تھا، خلیفہ عبدالمومن بن علی کا مدرسۂ حربیہ خاصۂ قابل ذکر ہے، جس کی تفصیل ہسٹری آف ڈومنین آف اسپین مصنفہ کانڈی (۱) سے قریب قریب اس کے لفظوں میں نقل کرتے ہیں۔

اس (عبدالمومن) نے ایک اسکول لڑکوں کے لیے بنایا، جس میں صرف علوم نہیں بلکہ سپہ گری کے کام بھی سکھائے جاتے تھے کیوں کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ صرف پڑھے لکھے قاضی تیار ہوں بلکہ اس کی خواہش تھی کہ لایق لایق گورنر ملکوں کے لیے اور فائق گروہِ قضاۃ شہروں کے انتظام کے لیے پیدا ہوں اور بڑے بڑے جنرل اور اچھے جنگ آور اس کے اسکول سے تعلیم پا کر نکلیں، ان کالج اور اسکولوں میں وہ مصامدہ اور دوسری قوموں کے شریف خاندانوں سے جوان کے ملک میں رہتے تھے، لڑکے جمع کرتا تھا جن کی تعداد تین ہزار تھی اور جو قریب قریب ایک ہی عمر ہونے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک ہی دن کے پیدا ہیں، یہ لڑکے حافظ اور طالبین کہلاتے تھے، کیونکہ وہ موطا یا اصول المہدی حفظ یاد کرتے تھے اور ایک دوسری بھی پڑھتے تھے جس کا نام مایطلبہ القاضی تھا، حافظین کو بادشاہ جمعہ کے دن الکوزر میں جمع کیا کرتا تھا، جس دن کہ وہ ازالہ جایا کرتا تھا وہ ان کو حکم دیتا تھا کہ ہفتے بھر کا پڑھا اس کے سامنے دوہرائیں، ہفتہ میں ایک دوسرے دن ان کو حکم دیتا تھا کہ شہسواری، ہتھیاروں کے کرتب، نیزہ بازی، گھوڑ دوڑ اور بہت سی مشقوں کا جو سپاہیوں کے لیے ضرور ہیں تماشا دکھلائیں، تیسرے دن ان کی تیراندازی کی مشق دیکھتا تھا اور ایک اور

(۱) دیکھو تاریخ مذکور جلد ثانی صفحہ ۴۷۵ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء

دن ان کی شناوری کی استادیاں ملاحظہ کرتا تھا جس کے لیے اس نے اپنے باغ میں ایک بڑا وسیع تالاب بنوایا تھا، جو تین سو قدم لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا، تالاب میں مختلف قسم کی کشتیاں اور اور قسم کی جو کہ خود اس نے ایجاد کی تھیں اور اس وضع کی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں، پڑی رہتی تھیں، وہ ان کشتیوں پر حافظین کو سوار کراتا تھا، جن میں بیٹھ کر ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور اپنے آپ کو بچانے میں وہ بڑی پھرتی اور چالاکیاں دکھلاتے تھے، عبدالمومن خود ان کو کشتیوں کے کھینے اور کسی خاص سمت لے جانے اور تمام ان اعمال کے طریقے بتاتا تھا جو سمندر میں جہازوں کے استعمال کے لیے ضروری ہیں، اس طرح پر ہفتہ کا ہر ایک دن کام میں لایا جاتا تھا اور ہر کام کے لیے ایک خاص دن مقرر تھا، یہ لڑکے بڑے جوش سے اپنا کام کرتے تھے، بوجہ ان گراں قدر انعاموں کے جو کہ عبدالمومن کی طرف سے ان نوجوانوں کو دئے جاتے تھے جنھوں نے فتح حاصل کی ہے یا اپنے فرائض میں زیادہ مشاق ہیں، یہ سب خرچ عبدالمومن خود دیتا تھا، یہاں تک کہ ہتھیار اور گھوڑے بھی اسی کے عنایت کیے ہوئے ہوتے تھے، ان حافظین میں ۱۳ لڑکے خود عبدالمومن کی اولاد تھے جو ہتھیاروں کے کام اور دوسری قسم کی مشاقیوں میں نہایت چالاک تھے، اس کے علاوہ وہ ذاتی اخلاق میں بھی نہایت برگزیدہ اور ممتاز تھے۔

یہ سب مدرسے وہ تھے جو ممالک اسلامیہ میں قایم ہوئے لیکن مسلمانوں کی علمی فیاضی اس وسیع دائرے میں بھی محدود نہ تھی، انھوں نے یورپ کے خاص شہروں میں بھی رصد خانے، صنعت گاہیں اور مدرسے قایم کیے، جن میں سے ایک کا ذکر گبن صاحب کی تاریخ سے انھیں کے الفاظ میں کرتا ہوں، وہ رومن امپائر حصہ مسلمانان فتح سلرنو کے ذیل میں لکھتے ہیں ''افریقہ اور ہسپانیہ اور سسلی میں جو عرب کی نو آبادیاں تھیں، ان کو یونانی دواؤں سے واقفیت حاصل ہوئی اور بوجہ اجتماع جنگ و صلح علم کا پرتو سلرنو جیسے مشہور شہر میں چمکا، ایک مدرسہ جو اول ہی اول فرنگستان کے زمانہ جہالت

میں قایم ہوا وہ فن جراحی کے لیے مخصوص تھا، اس مفید اور صحت بخش پیشہ کے لیے پادریوں اور راہبوں کی منظوری لے لی گئی تھی اور بہت سے نامی گرامی مریض دور دور مقامات کے سلرنو کے اطبا کے پاس رجوع کرتے تھے یا ان کو طلب کرتے تھے، یہ اطبا نارمنڈی کی فتحمندیوں کے ظلِ حمایت میں رہتے تھے، قسطنطین نام افریقہ کا ایک عیسائی انتیس برس سفرجح میں رہ کر اور زبان و علم عربی کی تحصیل کامل کر کے بغداد سے واپس آیا۔

اس طرح بوعلی سینا کے شاگرد کے مطب اور ہدایات اور تحریرات سے سلرنو مالا مال ہو گیا۔

☆☆☆

قدیم تعلیم

۱۴۵ھ اور تعلیم، تعلیم کی وسعت اور اس کے اسباب، طرزِ تعلیم، انقلابات، مختلف ملکوں کی خصوصیتیں، تعلیم کا مذہبی وتمدنی اثر

۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف وتالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو تعلم وتعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرزِ زندگی کے لیے موزوں تھی، علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا، بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرزِ تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند وروایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا، لیکن سو برس کی مدت میں تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا اور اسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب وباقاعدہ ہو چلی، اس دور میں جن علوم کو رواجِ عام حاصل ہوا وہ نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات اور ان کے متعلقات تھے، عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا مگر رواج عام نہ حاصل کر سکا، جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ ومنطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے، دیکھو ٹیکس سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے، حجازی فتوحات کا سیلاب اب رکتا چلا ہے، مفتوحہ ممالک میں امن وانتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے، سینکڑوں قبیلے ریگستانِ عرب سے نکل کر دور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں، بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے

اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم ہے، نہ یونی ورسٹیاں ہیں، نہ مدرسے ہیں، عرب کی نسلیں حکمراں ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا، تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے، ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم وفنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں، مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے، عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قایم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں، اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے علما کے ذاتی مکانات ہیں، لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے، بڑے بڑے عالیشان قصر وایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی، اگر چہ اس وقت اس زمانہ کا کوئی رجسٹر نہیں موجود ہے، جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے، لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑوں ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے ہم صحیح اندازہ کے قریب پہنچ سکتے ہیں، اگر چہ متواتر انقلابات، تخت گاہوں کی بربادی، اسپین کی تباہی، تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے، وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانہ کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں، تاہم ہر عہد میں ہم سیکڑوں ماہرین ومجتہدین فن کا نشان دے سکتے ہیں، صرف ہم عصر وہم وطن اہل کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، ڈاکٹر اسپرنگر صاحب تخمینہ کرتے ہیں (شاید حسن ظن ہو) کہ ''مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے''، اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ ☆

گروہ میں کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہوسکتا ہے۔

مشہور علما کے تعلیمی حالات پڑھو، ایک ایک استاد کے حلقۂ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب العلم مشغولِ درس نظر آئیں گے، علامہ ذہبی، طبقات میں ابوالتقی المتوفی ۲۵۱ھ کے ترجمے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''اس زمانے کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے، اس بڑے مجمع میں دوسو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد وفتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے''، خطیب مورخ بغداد علامہ ابو حامد اسفّرائنی کے حلقے میں خود شریک تھا، اس کا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس میں حاضر تھے، فراء نحوی نے کتاب المعانی کا جب لکچر دیا (جس کو عربی زبان میں املا کہتے ہیں) تو حاضرین میں سے ۸۰ صرف قاضی (۱) تھے، رضی الدین نیشاپوری کے حلقۂ درس میں چار سو فارغ التحصیل اہل علم حاضر ہوتے تھے، بصرہ کی جامع مسجد میں امام بخاری نے جب مجلسِ املا منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین، فقہا، حفاظ، اہل مناظرہ شامل ہوئے، خود امام بخاری سے جن لوگوں نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی ان کی تعداد قریباً نوے ہزار ہے (۲) اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہیں جن کا ہم استقصا نہیں کر سکتے۔

ہر قوم، ہر فرقہ، ہر طبقہ میں تعلیم کثرت سے جاری تھی، مصنفین و اہل فن کے حالات پڑھو، سیکڑوں ہزاروں اہل کمال ملیں گے جن کے باپ دادا خیاط، اسکاف، جولاہے، حلوائی، طباخ، حداد وغیرہ تھے، امرا کا عیش پسند گروہ بھی تعلیم سے مالا مال تھا، لوگ تعجب سے سنیں گے کہ ابن المعتز عباسی المتوفی ۲۹۶ھ جو علم بدیع کا موجد اور شاعری میں ابونواس و بشار کا ہمسر تھا اور ابوفراس جس پر عرب کی شاعری کا خاتمہ ہوگیا والیانِ ملک تھے اور حکیم بوعلی سینا و محقق طوسی وزارت کے بلند منصب پر ممتاز تھے۔

(۱) ان لوگوں کے تراجم دیکھو۔ (۲) دیکھو مقدمہ قسطلانی

اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی املا جس کو اردو میں لکچر دینا کہتے ہیں، استاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا، طالب العلم جو ہمیشہ دوات و قلم لے کر بیٹھتے تھے ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے، اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی، امالی ابن درید و ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں، جب معمول سے زیادہ طلبہ حلقۂ درس میں جمع ہوتے تھے تو استاد کے سامنے یا دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے جو دور والوں کو استاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے، یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے، یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، ابو بشر متی جو بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا، اس کے لکچر میں سیکڑوں طلبا شریک ہوتے تھے، جن میں فارابی بھی تھا اور اس نے کئی سو صفحے خود نقل کیے تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہل کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا، مشہور اہل فن کی لائف چھان ڈالو، ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جس نے تکمیلِ تعلیم کے لیے دو چار سو میل کی مسافت نہ طے کی ہو، اس زمانے میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوا، اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بغداد، نیشاپور، قرطبہ وغیرہ میں گو ہر فن کے کامل موجود تھے مگر ان شہروں کے رہنے والے بھی مشرق و مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔

علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انھیں علما کے حالات میں ہے جو اسپین سے مصر و شام و بغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر اسپین میں داخل ہوئے، جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لیے مسلمان ہمیشہ سفر کرتے رہے ہیں، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے۔

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا، مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر رہتے تھے، بعض امرا اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے، فقہ، ادب، نحو وغیرہ ہر ایک علم کے لیے جداگانہ مجلسیں تھیں، ان میں علما اور طلبا دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیہ کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا، یہ جلسے جن میں زیادہ تر انصاف اور حق پسندی کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصابِ تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پراثر تھے، تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عنایت کرتا تھا، جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا، جو علما کا مخصوص لباس تھا۔(۱)

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے۔(۱) تعلیم، مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی، قرآن و حدیث (جس پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں، اتنے تعلق سے نحو، صرف، لغت، معانی، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے، فلسفہ نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی، اس سلسلے نے بڑھتے بڑھتے قریباً ہر علم وفن کو اپنے دائرہ میں لے لیا تھا، اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے، جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے، جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے، جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہوگی تو کس حد تک پہنچا کر رہے گی، عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول

(۱) علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''اول جس شخص نے علما کے لیے خاص لباس قرار دیا وہ قاضی ابو یوسف صاحب ہیں، وہی لباس اب بھی چلا آتا ہے'' یہ لباس طیلسان کے علاوہ ایک جبہ ہوتا تھا جو آج کل کی ایم اے کے گون سے بہت مشابہ تھا، اس میں ہڈ بھی لگا ہوتا تھا (دیکھو حسن المحاضرہ جلد ثانی صفحہ ۲۲۶ مطبوعہ مصر)

کر چکی تھی، مذہب نے ان کو بھی انھیں سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا جو عرب کے ذاتی خاصے تھے اور چونکہ وہ مدت سے تمدن و معاشرت کی آبادی میں بسر کرتے آئے تھے، تعلیم کے معاملے میں انھوں نے اپنے استاد (عرب) سے زیادہ کام دیا، یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول، فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں، علامہ ابن خلدون نے اس پر مقدمۂ تاریخ میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جس کی سرخی یہ ہے ''حملۃ العلم فی الاسلام اکثرہم العجم''، یعنی اسلام میں علم کے حاملین اکثر عجم ہیں، ہمارے اکثر اخوان جو عرب کی نسل سے ہیں اس بات کو رشک اور تعجب سے سنیں گے مگر ان کو ہشام و عیسیٰ (۱) کی طرح صبر کرنا چاہیے۔

(۲) تعلیم مسجدوں اور علما کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی۔ وزرا، حکام، فوجی افسر، اہل منصب، ہر طبقہ کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے، وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بھی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلبا کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا۔

(۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی، کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضرور نہیں تھی جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا، اہل کمال کے زمرے میں سیکڑوں گذرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فن میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے۔

(۴) امرا اور اہل منصب کا گروہ جو شایقینِ علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا، تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا، سلاطین و وزرا تو ایک

(۱) ہشام بن عبدالملک دولت بنو امیہ کا نامور خلیفہ تھا، راوی کا بیان ہے کہ مجھ سے ہشام نے پوچھا کہ اس وقت مکہ میں علم کا سردار کون ہے، میں نے کہا: عطا (ہشام) وہ عربی الاصل ہے (میں) نہیں، اسی طرح اس نے شام، مصر، جزیرہ، خراسان، بصرہ کی نسبت پوچھا میں نے مکحول، یزید، میمون، ضحاک کے نام لیے، ہر نام پر پوچھتا جاتا تھا کہ عربی الاصل ہے اور مجھ سے ''نہیں'' کا لفظ سن کر پیچ و تاب کھا جاتا تھا، اخیر میں میں نے کہا کہ ابراہیم نخعی جو کوفہ کا امام ہے عربی الاصل ہے، اس پر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ ''خیر اس سے کچھ تسکین ہوئی'' (فتح المغیث صفحہ ۴۹۸) عیسیٰ کی نسبت بھی ایک اسی قسم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے بدل نہ تھیں بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبولِ عام مہنگے داموں کو خریدا جاتا تھا، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا، تصنیفات میں زورِ طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانوں کے سامنے پیش کرنا چاہے، وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں۔

مدرسوں کے قایم ہونے نے دفعۃً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی، نصابِ تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا، پرایویٹ تعلیم گاہیں عموماً قایم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی، لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا، آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدت معین ہو چکی تھی، گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی، مثلاً مغرب (مراکو وغیرہ) میں سولہ برس اور ٹیونس میں پانچ برس طالب کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا، املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا، آٹھویں صدی میں حافظ زین الدین عراقی نے (حافظ ابن حجر کے استاد تھے) اس کو زندہ کرنا چاہا اور قریباً چارسو مجلسوں میں اس طرح درس بھی دیا، حافظ ابن حجر وسخاوی نے بھی ان کی تقلید کی مگر انھیں بزرگوں پر خاتمہ ہو گیا، جلال الدین سیوطی نے ارادہ کیا مگر لوگوں کی بے توجہی دیکھ کر خود باز رہے۔

یہ مدرسے اکثر مذہبی تھے اور کسی ایک مذہب کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے دارالعلوم نظامیہ صرف شافعیوں کے لیے تھا، مستنصریہ وغیرہ میں چاروں مذہب کا درس ہوتا مگر مدرسین و نصابِ تعلیم بالکل جداگانہ تھے، اس خصوصیت نے مذہب پر ایک نمایاں اثر ڈالا، چوتھی صدی میں بلکہ اس سے پہلے تقلید مذہبی کی بنیاد پڑ چکی تھی،

مگر ان مدرسوں نے چونکہ اس کو محسوس صورت میں دکھایا، قوم میں اس کا عام رواج ہو گیا اور نہایت سختی کے ساتھ ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب نے تقلید شخصی کی ابتدا چوتھی صدی کے بعد قرار دی ہے(۱)، ہر شخص بہ آسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان مدرسوں نے جو تقلید شخصی کے ہم زماں ہیں یا خود تقلید کو پیدا کیا ہوگا یا کم سے کم اس کو ترقی اور استواری دی ہوگی، مدرسوں کے ابتدائی زمانہ میں تو ایسے علما کثرت سے تھے جو اجتہاد کا حق رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تقلید کے عام رواج نے علوم اور ایجاد کی قوت کو اس قدر گھٹا دیا کہ گویا قوم سے اجتہاد کی قابلیت ہی جاتی رہی، شاہ ولی اللہ صاحب نے کتاب الانصاف میں نہایت سچ لکھا ہے کہ اس زمانے میں (یعنی پانچویں چھٹی صدی میں) تقلید ہی ضروری تھی۔

تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق وامثال ذلک ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ انھیں کے نذر ہو گیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہو سکتی۔ ''تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا'' (۲) اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا، پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی، لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی، ہمارے ہندوستان میں تو ضمیروں کے مرجع اور حیثیت تعلیلی و تقلیدی و بعدیت ذاتی و زمانی کے تنگ دائرے سے طلبا تو کیا اکثر علما بھی کبھی باہر نہیں نکلے۔

ان مدرسوں میں (ترکی مدارس کے سوا) فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں تو ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی، لیکن اس کا الزام

(۱) دیکھو حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۵۸ (۲) علامہ ابن خلدون نے ان دونوں باتوں پر نہایت عمدہ بحث لکھی ہے، دیکھو مقدمہ تاریخ فصل ۶ کی فصل ۲۰ و فصل ۳۱

بانیانِ مدرسہ پرنہیں ہے بلکہ قوم کے ان بزرگواروں پر ہے، جو دینی یا دنیوی حیثیت سے قوم پر حکمراں تھے، ہم لکھ آئے ہیں کہ مسلمانوں میں علوم کی بنیاد مذہب کی زمین پر رکھی گئی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں کی اجتہادی رائیں جدھر رخ کریں علوم بھی ان کا ساتھ دیں، اسی وجہ سے مملکتِ اسلامی کے ہر گوشے میں رہ رہ کر فلسفہ کو صدمے اٹھانے پڑتے تھے، معتضد باللہ خلیفہ عباسی نے جو ۲۷۹ھ میں تخت نشیں ہوا، پہلے ہی سال فرمان نافذ کیا کہ کتب فروش فلسفہ کی کتابیں نہ بیچنے پائیں (۱) حکیم ابن رشد کو اپنی فلسفی تصنیفات سے اس لیے خود انکار کرنا پڑا کہ خاندانِ عبدالمومن (سلاطین مراکو) نے اس جرم پر اس کو قید کردیا تھا، اسی خاندان کے ایک فرماں روا نے جس کا نام مامون تھا، حکیم بن حبیب کو قتل کرادیا (۲)، سلطنت عثمانیہ میں بھی ایک مفتی صاحب نے فلسفہ کا درس بند کرادیا (۳)، حافظ جلال الدین سیوطی نے علم منطق کے ناجائز ہونے پر ایک کتاب ہی تصنیف کرڈالی جس کا نام ''القول المشرق فی تحریم الاشتغال بالمنطق'' ہے، علامہ ابن الصلاح نے بھی اس مضمون کا ایک فتوی لکھا (۴)، علامہ ابن تیمیہ مامون الرشید پر ہمیشہ ترس کھاتے رہے کہ دیکھیے اس جرم پر (فلسفہ کا رواج دینا) ''خدا اس سے کیا مواخذہ کرتا ہے''، اسپین میں امرا اور خواص فلسفہ کے حامی تھے، لیکن عوام کی برہمی کے خوف سے کبھی اس علم کو عام آزادی نہیں دی گئی (۵) تاہم مجھ کو اقرار کرنا چاہیے کہ فلسفہ کے دوستوں کی تعداد (عوام کا ذکر نہیں) دشمنوں سے زیادہ تھی۔

مذہب نے تعلیم پر جو بڑا نمایاں اثر دکھایا وہ یہ ہے کہ قدیم عربی زبان نہایت احتیاط سے محفوظ رہی، حالانکہ قدیم عربی ایک مدت سے نہ ملک کی زبان ہے، نہ حکومت کی۔ فارس وخراسان کی عام زبان فارسی تھی، عباسی جو بغداد میں خلیفہ کہلاتے

---

(۱) تاریخ الخلفا خلافۃ معتضد باللہ (۲) نفح الطیب تاریخ اسپین مطبوعہ فرانس جلد ثانی صفحہ ۱۲۵
(۳) کشف الظنون ذکر علم حکمت (۴) حسن المحاضرہ ترجمہ حافظ جلال الدین سیوطی
(۵) نفح الطیب جلد اول صفحہ ۱۳۶۔

تھے، ان کا جاہ وجلال بغداد کی شہر پناہ تک محدود تھا، عنانِ حکومت دیلم و سلجوق کے ہاتھ میں تھی جو زبان اور اصل دونوں اعتبار سے عجمی تھے، مصر و شام ایک مدت تک ایوبیہ، نوریہ، چراکسہ کے قبضہ میں رہے اور یہ سب عجمی تھے، ممالک مغربی (مراکو، تونس وغیرہ) میں بربروز تاتہ کی عملداری تھی، خود عرب میں قدیم عربی کا رواج نہیں رہا تھا، غرض اس کے زندہ رہنے کا کوئی سہارا نہ تھا لیکن صرف اس بات نے کہ قرآن پاک اور حدیث اسی زبان میں تھی، اس کہنہ زبان کو تیرہ سو برس کی عمر دی اور خدا سے امید ہے کہ قیامت تک اس کو قایم رکھے۔

اس بات کا بے شبہ افسوس ہے کہ اس یکطرفہ توجہ نے موجودہ زبان سے ہم کو بالکل محروم رکھا، آج چھ سو برس ہوئے کہ عرب کی زبان بالکل بدل گئی، سیکڑوں نئے الفاظ کا داخل ہو جانا، مختلف تصرفات وتبدیلیاں، نئے محاوروں کا استعمال، یہ سب ایک طرف خود اعراب وترکیب کی وہ حالت نہیں رہی، موجودہ علم نحو سرے سے بیکار ہو گیا ہے، تقریباً پانچو برس سے عرب اسی نئی زبان میں شعر وقصائد لکھتے ہیں، اسی زبان میں ان کے فصیح و بلیغ خطبے پائے جاتے ہیں، لوگوں کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یہ قصائد اگر اعراب کے ساتھ پڑھے جائیں تو موزوں نہیں رہتے، افسوس ہے کہ اس جدید مستقل زبان پر کسی نے توجہ نہ کی اور ان اشعار وخطب کے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی لغت موجود نہیں (۱) کس قدر افسوس وشرم کی بات ہے کہ ان لغات محدثہ کے لیے ہم کو عیسائی فاضلوں کا دریوزہ گر ہونا پڑتا ہے یعنی پروفیسر پطرس کا جس نے نہایت تحقیق سے محیط المحیط لکھی ہے اور لین صاحب انگلشی کا جن کی کتاب مد القاموس کی ۷ جلدیں لندن میں چھپ چکی ہیں۔

اسلام جس وسیع دنیا پر حکومت کر رہا تھا، اس میں جغرافی تقسیم کی حیثیت سے

---

(۱) علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ میں اس بحث پر متعدد مضمون لکھے ہیں بہت سے اشعار بھی نقل کیے ہیں، جو اس نئی زبان میں شعراے عرب نے لکھے اور جن میں اعراب کا مطلق پتہ نہیں

مختلف ملک شامل تھے اور متعدد قومیں آباد تھیں، اسلامی اتحاد نے اگرچہ ہر حصہ میں یکساں طور پر علوم کی روشنی پھیلائی مگر ملکی وقومی خصوصیتوں نے مختلف صورتیں پیدا کیں۔

ایران نے منقولی علوم کے علاوہ عقلیات کو معراجِ کمال تک پہنچایا، مصر و شام میں فقہ، حدیث و اسماء الرجال پر زیادہ توجہ ہوئی، حافظ جلال الدین سیوطی، مصر کی فضیلت کی ایک بڑی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ''وہاں فلسفہ کا زور نہیں ہے''، اسپین میں زباندانی، شاعری، تاریخ کو زیادہ فروغ ہوا، یہاں تک کہ لڑکوں کو قرآن پڑھنے کے زمانے سے اشعار و امثال یاد کرائے جاتے تھے، یہ اختلاف انھیں ملکی خصوصیتوں کا اثر تھا، ایرانیوں کے ذہن کی لطافت، موشگافی، دقیقہ سنجی، فلسفہ و منطق کے بالکل مناسب تھی، مصر و شام عرب کے دامن میں تھے اور اسوجہ سے قوت حافظہ کی عمدگی اور متوسط ذہانت نے حدیث و اسماء الرجال کو زیادہ پسند کیا، اسپین عرب ہونے کی حیثیت سے مصر و شام کا ہم پایہ تھا لیکن اتنی خصوصیت نے کہ وہاں مدت تک عرب خاندان حکومت کرتے رہے جو شعر و شاعری پر جان دیتے تھے، اسپین میں ادب و شاعری کو زیادہ چمکایا، شام میں بھی آلِ حمدان کے زمانے میں جو عموماً سخنور تھے، شاعری کا پایہ نہایت بلند ہو گیا تھا۔

انقلاباتِ حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوا کیے، علمی مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے، ایک خاندان کو کلیۃً برباد ہو جاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے، جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے تھے، دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کر سکتی تھی، ہلاکو خان نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا، تاہم اوقاف میں کچھ تصرف نہ کر سکا، اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقق طوسی کے ہاتھ میں دیئے، جس کا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا، ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکامِ سلطنت اور عظمت و جلال قایم رکھنے کے لیے ضرور تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومت سے زیادہ

فیاضیاں دکھائے، اس بات سے تعجب اورافسوس دونوں ہوتا ہے کہ پچھلی تعلیم جس کا اثر اہوا خاکہ اب بھی ہندوستان میں موجود ہے، پولیٹکل آواز سے بالکل خالی تھی، نصابِ تعلیم میں ایسی کوئی کتاب داخل نہ تھی، تاریخ کی کتابیں اگر پڑھائی جاتی تھی تو تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ فن انشا کے اعتبار سے، طالب العلموں کی سادہ اور مفلسانہ طرز زندگی، دنیوی خواہشوں سے مبرااور بےغرض شوق، کمالات علمی کے لیے جس قدر زیادہ مفید تھا، اسی قدر ان کو معاملات ملکی سے الگ رکھتا تھا، ہم کو تو جرأت نہیں ہوسکتی مگر علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ (گو بیانِ سبب میں ہم سے مختلف ہیں) کہ ''**ان العلماء من بین البشر أبعد الامم عن السیاسة**''(۱) یعنی نوعِ بشر میں عالم لوگ انتظامات ملکی سے بہت دور ہیں۔

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتادینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے، ہماری علمی فیاضیوں اورایجادات وصنائع کو مدرسوں کے احاطہ سے باہر ڈھونڈھنا چاہیے، مدرسوں کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا، ۷۴۸ھ میں جبکہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا، خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے جن میں ہر قسم کے علوم وفنون پڑھائے جاتے تھے۔(۲)

مین نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب وتاب سے لکھوں، قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا، سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں، ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

مولف

گرفتم کز حریفان بیش یا کم میتواں گفتن ''زدستت تا چہ آمد'' آخرا ینہم میتواں گفتن

(۱) دیکھو مقدمہ ابن خلدون فصل ۶ کی فصل ۳۵ (۲) حسن المحاضرہ جلد ثانی ص ۱۸

ملا نظام الدین علیہ الرحمہ

بانیِ درسِ نظامیہ

آج تمام ہندوستان میں عربی تعلیم کا جو نصاب ہے، وہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، لیکن یہ سخت تعجب ہے کہ اکثر لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہ نصاب کب بنا؟ اور کس نے بنایا؟ حال کی ایک تصنیف میں اس کو نظام الملک وزیر دولت سلجوقیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، پرانے تعلیم یافتہ اس قدر جانتے ہیں کہ اس کے بانی ملا نظام الدین صاحب لکھنوی ہیں لیکن اس سے زیادہ ان کو بھی واقفیت نہیں۔

ملا نظام الدین صاحب جس رتبہ کے شخص تھے اور خصوصاً اس نصاب کے قائم کرنے سے ان کو جو شہرت حاصل ہوئی، اس کے لحاظ سے میں ایک مدت سے اس بات کا آرزومند تھا کہ ان کے مفصل حالات دریافت کروں، لیکن چونکہ ہمارے ملک میں بیوگرفی (سوانح عمری) لکھنے کا طریقہ بہت کم تھا، اس لیے اس آرزو کے پوری ہونے کی بہت کم امید ہوسکتی تھی، میر غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے جو بالکل ناکافی ہے، بڑے تلاش سے ایک رسالہ ہاتھ آیا جو مولانا ولی اللہ صاحب فرنگی محلی (محشی صدرا) کی تصنیف ہے اور خاص ملا صاحب مرحوم کے حالات میں ہے لیکن اس میں اصلی حالات نہایت کم ہیں، البتہ ان کی کرامتوں اور خرق عادات کا ایک بڑا دفتر ہے، وہ اس زمانہ کے کام کا نہیں۔

تاہم بمصداق ماالا یدرک کلہ لایترک کلہ میں ایک مختصر سا خاکہ ان کی سوانح

عمری کا ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

خاندان کا حال: لکھنؤ کے اطراف میں جو مردم خیز بستیاں ہیں، ان میں ایک مشہور قصبہ سہالی ہے جو لکھنؤ سے اٹھائیس میل ہے، یہاں مسلمانوں کے دو مشہور خاندان آباد تھے، انصاری جو حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھے، عثمانی یعنی حضرت عثمانؓ کی اولاد سے، ملا صاحب اسی قصبہ کے رہنے والے تھے اور انصاری خاندان سے تھے، ان کے والد ملا قطب الدین بہت بڑے مستند عالم تھے اور ان کا حلقۂ درس تمام مشرقی ممالک کا قبلہ گاہ تھا، عثمانیوں اور انصاریوں میں قدیم سے عداوت چلی آتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن عثمانی ملا صاحب کے گھر پر چڑھ آئے اور ان کو قتل کر کے گھر میں آگ لگادی، یہ واقعہ ۱۱۰۳ھ میں پیش آیا، چونکہ وہ بے گناہ قتل کیے گئے تھے، قوم نے ان کو شہید کا لقب دیا، چنانچہ کتبِ علمیہ میں جہاں ان کا نام آتا ہے اسی لقب کے ساتھ آتا ہے، ملا قطب الدین صاحب کے چار فرزند تھے، بڑے صاحبزادے اس وقت دلی میں عالمگیر بادشاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، شیخ محمد سعید، شیخ محمد اسعد اور ملا نظام الدین مکان پر تھے، ملا قطب الدین صاحب کی شہادت کے بعد یہ لوگ بے کسی کی وجہ سے سہالی سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے لیکن یہاں رہنے کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، سلطنت تیموریہ کے زمانے میں چونکہ واقعہ نگاری کا صیغہ نہایت وسعت کے ساتھ قائم تھا اور ملک کا ایک ایک جزئی واقعہ دربار شاہی تک پہنچتا رہتا تھا، لکھنؤ کے واقعہ نگار نے فوراً دربار کو اطلاع دی اور وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ ملا صاحب کے صاحبزادوں کو فرنگی محل کے محلّہ میں ایک قطعہ مکان مع عمارات متعلقہ عنایت کیا جائے، اطلاع کی تاریخ ۱۴ ر شعبان ۳۷ جلوس والا مطابق ۱۱۰۵ھ اور فرمان صادر ہونے کی تاریخ ۱۱ ر شوال ۳۸ جلوس والا ہے، اس فرمان کی کچھ عبارت ہم آگے نقل کریں گے۔

لکھنؤ میں آباد ہونے کا سبب: ملا نظام الدین صاحب جن کا ہم تذکرہ لکھ رہے

ہیں، اس وقت پانزدہ سالہ تھے، اس لیے فرمان میں ان کا نام نہیں بلکہ ان کے دونوں بڑے بھائیوں کا ہے، یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں اس کی زیارت کی تھی، چنانچہ ہم اس کے ضروری الفاظ اس موقع پر درج کرتے ہیں، پیشانی پر عالمگیر کی مہر ہے۔

عالمگیر کا فرمان: دامن میں یہ عبارت ہے:

''دریں وقت میمنت اقتران فرمان والا شان واجب الاذعان صادر شد کہ یک منزل حویلی فرنگی محل با متعلقۂ آن واقع بلدہ لکھنؤ، مضاف بہ صوبہ اودھ کہ از امکنۂ نزدلی است برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسرانِ ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و مصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران و کرداریان آنرا بنام مشار الیہا معاف و مرفوع القلم دانستہ بہیچ وجہ من الوجوہ مزاحم و معترض نہ شوند، واندرین باب سند مجدد نہ طلبند''

مرقوم غرۂ ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد

فرمان کی پشت پر جو عبارت ہے، اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:

''شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنج شنبہ ۱۴ر شعبان المعظم جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ برسالہ صدارت و مشیخت پناہ، فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوارِ مرحمت و احسان صدر منیع القدر فاضل خان ونوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی میگردد کہ بعرض مقدس و معلی رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسرانِ ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبۂ مذکور را گذاشتہ جلاوطن گردیدند و کدام مکانہا سکونت ندارند الخ''

طالب علمی: جس وقت ملا قطب الدین کا خاندان لکھنؤ میں آباد ہوا، ملا نظام الدین صاحب کی عمر پندرہ برس کی تھی اور شرح جامی پڑھتے تھے، اگر چہ اس وقت تک اطمینان کی معقول صورت نہیں پیدا ہوئی تھی، تاہم ملا صاحب نے فراغ خاطر کا انتظار نہ کیا اور علوم کی تحصیل جاری رکھی، غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ ''ملا صاحب نے پورب کا سفر کیا اور مختلف شہروں میں تحصیل کی، اخیر میں لکھنؤ واپس آ کر شیخ غلام نقشبندی لکھنوی سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور انھیں سے سندِ فضیلت حاصل کی''، لیکن مولوی ولی اللہ صاحب نے جو مستقل رسالہ ان کی سوانح عمری میں لکھا ہے، اس میں لکھا ہے کہ ''ابتدائی کتابیں دیوا میں اور قصبات میں جا کر پڑھیں، لیکن انتہائی کتابیں بنارس میں جا کر حافظ امان اللہ بنارسیؒ سے ختم کیں''، فرنگی محل میں آج جو روایت مشہور ہے، وہ بھی اسی کی موید ہے۔

فراغِ تحصیل کے ساتھ ہی ملا صاحب اپنے والد بزرگوار کے مسندِ درس پر متمکن ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا آستانہ تمام مشرقی ہندوستان کا مرجع بن گیا۔

تصوف: علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو کر ملا صاحب نے علوم باطنی کی طرف توجہ کی، اس وقت حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب بانسوی کے فیوض و برکات کا تمام ہندوستان میں غلغلہ تھا، ملا صاحب ان کے آستانے پر حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی، شاہ صاحب موصوف علوم رسمیہ سے نا آشنا تھے، اس لیے تمام لوگوں کو استعجاب ہوا، یہاں تک کہ علماے فرنگی محل نے علانیہ ملا صاحب سے شکایت کی، ملا صاحب کے تلامذہ میں سے ملا کمال علوم عقلیہ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے اور چونکہ بے انتہا ذہین اور طباع تھے، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ملا صاحب کی بیعت پر دوبدو گستاخانہ عرض کیا کہ ''آپ نے ایک جاہل کے ساتھ پر کیوں بیعت کی''، اس پر بھی قناعت نہ کر کے شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور فلسفہ کے چند مشکل مسئلے سوچ کر گئے کہ شاہ صاحب سے پوچھیں گے اور ان کو الزام دیں گے، مشہور ہے کہ شاہ

صاحب نے خود ان مسائل کو چھیڑا اور ملا کمال کی خاطر خواہ تسکین کر دی، چنانچہ اسی وقت ملا کمال اور ان کے ساتھ بہت سے علما شاہ صاحب کے قدموں میں گرے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

شاہ صاحب نے ۱۱۳۶ھ میں رحلت فرمائی، ان کی وفات کے بعد ملا نظام الدین نے ان کے خلیفہ سید اسماعیل بلگرامی سے باطنی فیوض حاصل کیے۔

بیماری اور وفات: ملا صاحب کو ابتدا سے قرحہ کا مرض تھا لیکن کبھی معالجہ کی طرف توجہ نہ کی اور اخیر عمر میں جب کہ سن شریف ۷۵ برس کو پہنچ گیا، نہایت ضعیف ہو کر صاحبِ فراش ہو گئے اور زنان خانہ میں رہنے لگے، لیکن چونکہ نہایت کثرت سے لوگ بیمار پرسی کو جاتے تھے اور بار بار پردہ کرانے میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی تھی، ملا احمد عبدالحق صاحب نے عرض کیا کہ حضور اگر دیوان خانہ میں تشریف رکھتے تو بہتر ہوتا، ملا صاحب نے کچھ جواب نہ دیا، دوسرے دن شاہ عبدالغنی صاحب عیادت کو آئے تو ملا صاحب نے یہ مصرعہ

''ہر روز بینم تنگ تر سوراخِ ایں غربالہا''

پڑھ کر فرمایا کہ اچھا میاں عبدالحق ہی کی مرضی پر عمل کرو، چنانچہ دیوان خانہ میں اٹھ کر تشریف لائے اور وہیں وفات کی۔

ملا صاحب کی دو بیویاں تھیں، دوسری شادی غالباً اس غرض سے کی تھی کہ پہلی سے اولاد نہیں ہوتی تھی، بیماری کو جب اشتداد ہوا تو زوجہ اولیٰ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ مجھ سے جو تقصیر ہوئی ہو معاف فرمایئے، فرمایا تم نے کوئی تقصیر نہیں کی، البتہ مجھ سے یہ گناہ ہوا کہ تمہارے ہوتے دوسری شادی کی، اس جرم کو معاف کر دو، تھوڑی دیر کے بعد زوجۂ ثانیہ آئیں اور کہا کہ آپ تو تشریف لیے جاتے ہیں اولاد کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں، ملا صاحب کو سخت رنج ہوا، حاضرین سے کہا کہ مجھ کو اٹھا کر بٹھا دو، پھر فرمایا کہ ''نظام الدین تو جاتا ہے لیکن خدا ہمیشہ رہے گا۔''

تاریخ وفات: آخر نویں تاریخ جمادی الاولیٰ روز چہار شنبہ ۱۱۶۱ھ میں دو پہر دن چڑھے انتقال فرمایا، تاریخِ وفات یہ ہے۔

ملک بود و بیک حرکت ملک گشت

عربی مادہ یہ ہے

مال العاشق الی المعشوق

اخلاق وعادات: ملا صاحب ابتدا ہی سے نہایت غنی النفس اور متوکل تھے، ان کی علمی شہرت ان کی زندگی ہی میں اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ وہ ذرا سی خواہش کرتے تو ہر قسم کا جاہ و منصب حاصل ہو سکتا تھا لیکن اس طرف توجہ نہ کی، تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے اور نہایت استقلال کے ساتھ برداشت کرتے تھے، امرا اور اہلِ دول سے بالکل نہیں ملتے تھے بلکہ اس قسم کے لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تو بے التفاتی ظاہر فرماتے، شیخ غلام مخدوم کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا اور بیماری کی وجہ سے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا، اتفاقاً امرا میں سے ایک صاحب ملنے کے لیے آئے، میں نے ان کے لحاظ سے پلنگ پر سے اتر آنا چاہا، ملا صاحب نے فرمایا کہ ''سفید پوشوں کو دیکھ کر بدحواس کیوں ہوتے ہو، آرام سے لیٹے رہو۔''

امرائے شاہی میں سے ایک رئیس جو ہفت ہزاری کا منصب رکھتا تھا، ملا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا، ایک دفعہ جمعہ کے دن عین نماز کے وقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ ذرا انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر ہو کر حضور کی اقتدا کا شرف حاصل کر سکوں، ملا صاحب نے ایک ذرا دیر انتظار فرمایا پھر کہا کہ ''نماز خدا کے لیے ہے، اہل دنیا کے لیے نہیں ہے''، یہ کہہ کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔

بے نفسی: لیکن یہ بے نیازی اور بد دماغی امرا اور جاہ پرستوں کے لیے مخصوص تھی، ورنہ مزاج میں مسکینی اور تواضع تھی، ایک دن ایک ایرانی ابوالمعالی نام ملا صاحب کا شہرہ سن کر ملاقات کے لیے آیا، ملا صاحب درس گاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے

رہے تھے، اس نے ایرانی علما کا جاہ وجلال دیکھا تھا، ملا صاحب کی طرف اس کا خیال نہ جاسکا، لوگوں سے پوچھا ملا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا لیکن نظام الدین میرا ہی نام ہے، اس نے چند فقہی مسائل پیش کیے کہ اہل حق (یعنی شیعہ مذہب والوں) کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے، ملا صاحب نے اس کا منشا سمجھ کر شیعوں کی روایتوں کے مطابق جواب دیا، نہایت پسند کیا اور کہا کہ انھیں مسئلوں کو اہل ضلالت (سنیوں) کے مذہب کے موافق بیان فرمایئے، ملا صاحب نے سنیوں کی روایتیں بیان کیں، وہ عش عش کر گیا اور کہا کہ جس قدر سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔

علما کی نسبت عام شکایت ہے کہ علمی مباحثات سے ہمیشہ ان کو فخر اور امتیاز مقصود ہوتا ہے اور اس لیے وہ کبھی حریف کے مقابلہ میں سکوت اختیار نہیں کرتے ،لیکن ملا صاحب اس عیب سے بالکل پاک تھے، ایک دفعہ ایک صاحب ان سے بحث کرنے کے لیے تشریف لائے، ملا صاحب نے مسئلہ کی تحقیق بیان فرمائی، انھوں نے اعتراض کیا، ملا صاحب چپ ہوگئے، انھوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ میں نے ملا نظام الدین کو بند کردیا، ملا صاحب کے تلامذہ کو ناگوار گذرا اور ایک شاگرد نے جاکر ان صاحب کو زورِ تقریر سے بالکل ساکت کردیا، ملا صاحب کو خبر ہوئی تو اس قدر برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقۂ درس سے الگ کردیا اور کہا کہ میں ہرگز یہ نہیں پسند کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

تصنیفات: ملا صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں مثلاً شرح مسلم الثبوت، شرح منار مسمیٰ بہ صبح صادق، حاشیہ صدرا، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ، یہ تمام کتابیں بڑے پایہ کی ہیں اور نہایت دقیق تحقیقات پر مشتمل ہیں، لیکن درحقیقت ملا صاحب کی شہرت ان تصنیفات کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے طریقۂ درس کے بدولت ہے، ملا صاحب کے زمانہ میں ہندوستان کے تمام اطراف میں بڑے بڑے علما موجود

تھے اور ہر ایک کی الگ الگ درس گاہ قائم تھی، مثلاً ملا محبّ اللہ بہاری مصنف سلم و مسلم متوفی ۱۱۱۹ھ، ملا جیون مصنف نور الانوار المتوفی ۱۱۱۳ھ، سید عبد الجلیل بلگرامی استاد غلام علی آزاد المتوفی ۱۱۲۶ھ، میر غلام علی آزاد بلگرامی، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی المتوفی ۱۱۷۴ھ، لیکن ملا صاحب کے حلقۂ درس سے جس رتبے کے فضلا پیدا ہوئے وہ خود ان بزرگوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے، ملا صاحب کے فرزند مولانا عبد العلی کو تمام ملک نے بحر العلوم کا لقب دیا جو آج تک مشہور ہے اور در حقیقت ہندوستان کی خاک سے کوئی شخص اس جامعیت کا شروع اسلام سے آج تک نہیں پیدا ہوا، ملا صاحب کے دوسرے شاگرد ملا کمال اس پایہ کے شخص تھے کہ مولوی حمد اللہ جن کی شرح سلم آج نصابِ تعلیم میں داخل ہے انھیں کے دامن فیض میں پلے تھے، ملا حسن کو بھی ملا صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

ملا صاحب کے درس نے اس قدر قبولیت حاصل کی کہ ہندوستان میں ہر جگہ سلسلہ بہ سلسلہ انھیں کے شاگرد نظر آتے تھے اور لکھنؤ کا فرنگی محل تو علم و فن کا معدن بن گیا، جہاں دو سو برس سے آج تک علمی سلسلہ منقطع نہیں ہوا اور سیکڑوں اہل کمال پیدا ہو کر پیوندِ خاک ہو گئے، ملا مبین، مولانا ظہور اللہ، مولانا ولی اللہ، مفتی محمد یوسف، مولانا عبد الحلیم، مولانا عبد الحیٔ صاحب مرحوم جو ہمارے زمانہ میں موجود تھے، ان کی تصنیفیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، آج جہاں جہاں علوم عربیہ کا نام و نشان باقی ہے، اسی خاندان کا پرتوِ فیض ہے، ہندوستان کے کسی گوشہ میں جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے، اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے، میں نے ۱۸۹۶ء میں جب ملا نظام الدین کے آستانہ کی زیارت کی اور ان کی درس گاہ کو جو ایک مختصر سا بالا خانہ تھا دیکھا تو عجب عبرت ہوئی، اللہ ا ہمارے ہندوستان کا کیمبرج یہی ہے، یہی خاک ہے جس سے عبد العلی بحر العلوم اور ملا کمال پیدا ہوئے، افسوس اب یہ کعبہ ویران ہوتا جاتا ہے، یادِ رفتگاں صرف ایک مقدس بزرگ مولانا نعیم صاحب باقی ہیں، جو عبد العلی بحر العلوم

کے پر پوتے ہیں اور جن کو ہماری سرکار نے شمس العلما کا خطاب دیا ہے۔

درس نظامیہ کے خصوصیات: ملا صاحب کے حالات میں سب سے زیادہ قابل توجہ ان کا مقرر کردہ نصاب ہے، جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، اس نصاب کے خصوصیات یہ ہیں:

(۱) نصاب میں ہندوستان کے علما کی متعدد کتابیں داخل ہیں مثلاً نور الانوار سلم، مسلم، رشیدیہ، شمس بازغہ، حالانکہ اس سے پہلے یہاں کی ایک تصنیف بھی درس میں داخل نہ تھی۔

(۲) ہر فن کی وہ کتابیں لی ہیں جن سے زیادہ مشکل اس فن میں کوئی کتاب نہ تھی۔

(۳) منطق وفلسفہ کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زیادہ ہیں۔

(۴) حدیث کی صرف ایک کتاب ہے یعنی مشکوٰۃ

(۵) ادب کا حصہ بہت کم ہے۔

اس نصاب میں سب سے زیادہ مقدم خصوصیت جو ملا صاحب کو پیش نظر تھی یہ تھی کہ قوتِ مطالعہ اس قدر قوی ہو جائے کہ نصاب کے ختم کرنے کے بعد طالب العلم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے، اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ درس نظامیہ کی کتابیں اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لی جائیں تو عربی زبان کی کوئی کتاب لاینحل نہیں رہ سکتی، بخلاف درس قدیم کے کہ اس سے یہ بات حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔

اختیار کے لحاظ سے بھی اس نصاب کو نصاب قدیم پر ترجیح ہے، ایک متوسط الذہن طالب العلم سولہ سترہ برس کی عمر میں تمام کتب درسیہ سے فارغ ہوسکتا ہے، چنانچہ علمائے فرنگی محل میں اکثر اتنی ہی عمر میں فارغ ہو جاتے تھے۔

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ چونکہ اس میں فقہ کی کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے، اس لیے اس نصاب

سے وہ تقشف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بیجا تعصب نہیں پیدا ہوتا تھا جو سطحی فقہا کا خاصا ہے، اسی کا اثر ہے کہ فرنگی محل میں جو بڑے بڑے علما پیدا ہوئے ان میں کسی نے مذہبی مناظرات کی کوئی کتاب نہیں لکھی، شیعہ وسنی کا جھگڑا سب سے زیادہ لکھنؤ میں پیدا ہوسکتا تھا، لیکن یہ صدا اولی سے بلند ہوئی اور گو تمام ملک اس ہنگامہ میں مبتلا ہوگیا اور تحفہ اثنا عشریہ کے فقرے رجز کی طرح مذہبی پہلوانوں کی زبانوں پر چڑھ گئے، تاہم علمائے فرنگی محل اخیر تک اس شورش سے الگ رہے، اس نصاب سے اور باتوں کے ساتھ ملا نظام الدین صاحب کی انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی کا بڑا ثبوت ملتا ہے، علما میں یہ خصلت بہت کم پائی جاتی ہے کہ ان کو معاصرین کے فضل وکمال کا اقرار ہو، لیکن ملا صاحب نے اپنے معاصر علما کی اس قدر عزت کی کہ ان کی کتابیں درس میں داخل کر دیں، نور الانوار، سلم ومسلم سب ان کے معاصرین کی تصنیفات ہیں اور درس نظامیہ میں داخل ہیں، ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اپنی کوئی تصنیف نصاب میں داخل نہیں کی حالانکہ ان کا کوئی معاصر ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ موجودہ درس جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، دراصل درس نظامیہ نہیں ہے، اس میں بہت سی کتابیں ایسی اضافہ ہوگئیں ہیں جو ملا نظام الدین صاحب کے عہد میں موجود بھی نہ تھیں مثلاً ملا حسن، حمد اللہ، حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک اگرچہ ہمارے نزدیک ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے درسِ نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم واضافہ کی ضرورت ہے لیکن اس مضمون میں ہم اس بحث کو نہیں چھیڑتے اور اسی تحریر پر بس کرتے ہیں۔

(معارف علی گڑھ فروری ۱۹۰۰ء)

درسِ نظامیہ (۱)

فرنگی محل یا نظامیہ بغداد یا ہندوستان کا کیمبرج

ہماری قدیم طرزِ تعلیم اور آج کل کی مغربی تعلیم میں اس قدر فرق ہے کہ چندروز کے بعد لوگوں کو قدیم تعلیم کی صحیح تصویر ذہن نشین کرانی مشکل ہوگی، جس طرح آج سلطنت تیموریہ کے اصولِ حکمت اور طریقۂ انتظام کا خاکہ لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا، ایک شاندار، عظیم الشان عمارت، ماہرانِ فن کا ایک گروہ، لکچروں کا ایک سلسلہ، چند محدود گھنٹے (جس کے بعد وہ عمارت قالب بے جان رہ جاتی ہے) یہ چیزیں یکجا ہو جائیں تو یہ ایک یونیورسٹی یا کالج ہے، لیکن قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود خاص کا نام تھا، وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا کالج بن جاتا تھا، اس کے گرد مستفیدوں کی ایک جماعت کثیر جمع ہو جاتی تھی، اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا، دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا علمی لکچر ہوتا تھا، اس کے حرکات وسکنات، نشست برخاست، وضع قطع، طور طریقے سب خاموش عملی لکچر تھے، شاگردوں کا سلسلہ

(۱) اس مضمون کی ماخذ حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) رسالہ قطبیہ درحال ملا قطب الدین شہید از ملا عبدالاعلیٰ فرزند مولوی عبدالعلی بحرالعلوم (۲) اغصان اربعہ مولوی ولی اللہ محشی صدرا (۳) عمدۃ الوسائل مولوی ولی اللہ صاحب موصوف الصدر درحال ملا قطب الدین و شاہ عبدالرزاق بانسوی (۴) اغصان الانساب مصنفہ رضی الدین محمود انصاری تصنیف ۱۲۶۰ ہجری، اس موقع پر مجھ کو جناب مولوی عبدالباری کا شکریہ ادا کرنا بھی فرض ہے جنھوں نے یہ کتابیں مجھ کو دیکھنے کے لیے عنایت کیں۔

درسلسلہ پھیلتا جاتا تھا، یہاں تک کہ چند دن کے بعد یہ ذی روح کالج، یونی ورسٹی یا جامعۂ اعظم بن جاتا تھا، آج لوگ کالج کی طرف منسوب ہوتے ہیں مثلاً آکسن لیکن اس زمانہ میں شخص کی طرف منسوب ہوتے تھے، نظامیۂ بغداد سے ہزاروں اربابِ کمال تعلیم پا کر نکلے لیکن اسماے رجال میں جہاں کہیں ان کا حال لکھا جاتا ہے، نظامیہ کا نام نہیں آتا بلکہ ان اساتذہ کا آتا ہے جن سے انھوں نے تعلیم پائی تھی، آج کل کی یونی ورسٹیاں یا کالج صرف بڑے بڑے شہروں میں قائم کیے جاسکتے ہیں لیکن اس وقت کے ذی روح کالج، ہر قصبہ، ہر گاؤں، ہر جھونپڑے میں قائم ہوسکتے تھے۔ دلی اور لکھنؤ پاے تخت تھے، لیکن علمی فیض رسانی میں سہالی، دیوا، گوپامئو، بلگرام جیسے دیہات ان دارالسلطنتوں سے بجا ہمسری کا دعویٰ کرسکتے تھے، ملا نظام الدین جن کے پرتو فیض سے آج تمام ہندوستان روشن ہے، ملا محب اللہ بہاری جن کے سلم اور مسلم نے آدھا حصہ درس کا دبالیا ہے، قاضی مبارک جن کی تصنیف کا سمجھنا منتہاے استعداد سمجھا جاتا ہے، یہ اہل کمال انھیں دیہات نے پیدا کیے تھے۔

اس قسم کے زندہ کالج اگرچہ ہندوستان کے ہر گوشہ میں موجود تھے لیکن نسبۃً اودھ کا صوبہ تمام اور صوبہ جات سے ممتاز تھا، اس صوبہ میں دس دس پانچ پانچ میل پر شرفا اور نجبا کے دیہات آباد تھے، جن میں اچھے اچھے نامور فضلا درس دیتے تھے اور دور دور سے تحصیل علم کے لیے طلبہ آتے تھے، سلاطین وقت کی طرف سے ان درس گاہوں کے لیے دیہات معاف تھے، مولوی غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، ہم اس موقع کا اقتباس نقل کرتے ہیں:

"اگرچہ جمیع صوبہ جات ہند بوجود حاملانِ علم تفاخر دارند اما صوبہ اودھ والہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتواں یافت، چہ درتمام صوبہ اودھ واکثر صوبہ الہ آباد بفاصلہ پنج کروہ نہایت دہ کردہ آبادی شرفا و نجبا ہست کہ از سلاطین و حکام، وظائف و زمین مدد

معاش داشتہ اند ومساجد و مدارس و خانقاہات بنانہادہ و مدرسان عصر
درہر جا ابوابِ علم بررو ے دانش پژدہان کشادہ وطلبۂ علم خیل خیل
میروند، وہر جا موافقت دست بہم داد بہ تحصیل مشغول میشوند وصاحب
توفیقانِ ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ میدارند، وخدمت این جماعہ را
سعادت عظمیٰ میدانند صاحب قران ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ می
گفت پورب شرازمملکت ماست'' (۱)

یہ نظام ۱۱۳۰ھ تک قایم رہا، جب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری اودھ کے صوبہ دار ہوئے تو تمام معافیاں ضبط کرلیں، علماوفضلا کی اولاد کسب معاش کی ضرورت سے پڑھنا پڑھانا چھوڑ کر سپہ گری میں مصروف ہوئی، مدرسے ویران ہو گئے اور علمی صحبتیں درہم برہم ہوگئیں، ۱۱۵۹ھ میں الہ آباد کا صوبہ بھی اس خاندان کے قبضہ میں آگیا اور صفدر جنگ صوبہ دار مقرر ہوئے، انھوں نے رہی سہی معافیاں بھی ضبط کرلیں، احمد شاہ کے زمانہ میں صفدر جنگ کو وزارت ملی، ان کے نائب وظیفہ داروں کو اور بھی زیادہ تنگ پکڑا اور اس طرح وہ تمام علمی بستیاں اجڑ گئیں۔ (۲)

غرض انھیں زندہ کالجوں میں ایک سہالی بھی تھی، جس نے آگے چل کر فرنگی محل کا قالب اختیار کیا، یہ لکھنؤ سے ۳۲ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو کسی زمانہ میں بہت بڑا قصبہ تھا، درس نظامیہ کا سنگِ بنیاد اسی سرزمین پر رکھا گیا۔

درس نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے، ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں سب اسی درس کی شاخیں ہیں، کوئی عالم عالم نہیں مانا جاسکتا جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اسی طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے، جس طرح کھوٹا سکہ ٹکسال باہر کہلاتا ہے، اسی طرح کسی کتاب کا درس نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی شہادت

(۱) کتاب مذکور تذکرہ ملا نظام الدین (۲) یہ پوری تفصیل مآثر الکرام میں ہے۔

ہے کہ وہ نصابِ تعلیم میں داخل ہونے کی قابلیت کا دعویٰ نہیں کرسکتی، درس نظامیہ اگرچہ خاص ہندوستان کا کارنامۂ فخر ہے لیکن نظام الملک نے بغداد میں جو مدرسہ اعظم نظامیہ کے نام سے قایم کیا تھا اس کی عالمگیر شہرت نے اس قدر وسعت درازی کی کہ اس سلسلہ کو بھی اس کے فہرست اعمال میں داخل کرنا چاہا، چنانچہ ہمارے زمانہ کے اکثر ناواقفوں کو دھوکا ہوگیا، یہاں تک کہ ایک اردو تصنیف میں صراحتہً یہ دعویٰ کیا گیا۔

درس نظامیہ اگرچہ ملا نظام الدین صاحب کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت اس کی تاریخ ایک پشت اوپر سے شروع ہوتی ہے یعنی ملا نظام الدین کے والد سے جن کا نام ملا قطب الدین شہید تھا اور اس لیے اس علمی لوح کے طغرا وہی قرار پاسکتے ہیں، تمام ہندوستان میں بلکہ انصاف یہ ہے کہ تمام دنیاے اسلام میں یہ بات صرف اسی مقدس ذات کو حاصل ہے کہ پورے دوسو برس تک متواتر اور بلافصل ان کی نسل سے علما ہوتے چلے آئے اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے، ہندوستان کی علمی تاریخ میں یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ اس ملک میں تاریخ اور رجال کا مذاق کم تھا لیکن اس سلسلہ نے خاص اپنے خاندان کا حال اس استقصا کے ساتھ لکھا کہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی، چنانچہ ہم کو اس مضمون کے لکھنے میں تاریخی معلومات کی حیثیت سے کوئی دقت نہیں پیش آئی۔

اسلام جب عرب سے نکل کر دور دور ممالک میں پھیلا تو اکثر عرب کے خاندان ہجرت کرکے ان ممالک میں چلے آئے، ان میں سے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی نسل سے ایک بزرگ ہرات میں آئے اور یہاں سکونت کی، ان کے خاندان سے ایک بزرگ علاء الدین انصاری (۱) ہندوستان آئے، چنانچہ ان کا مزار قصبہ برناوہ میں ہے جو دلی اور متھرا کی راہ میں واقع ہے، ان کی نسل سے شیخ نظام الدین سہالی میں

(۱) یہ تین بھائی ساتھ آئے تھے، ایک نے ان میں سے پانی پت میں قیام کیا، چنانچہ پانی پت کے انصاری انھیں کے خاندان میں سے ہیں، (رسالہ قطبیہ) اس بنا پر مولانا حالی اور علماے فرنگی محل ہم نسب ہیں۔

آئے، شیخ موصوف نے یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔

شیخ نظام الدین کے پر پوتے شیخ حافظ نے علم و عمل میں زیادہ شہرت حاصل کی، یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا، تیموری حکومت کی یہ خصوصیت اس کے کارناموں کا طغرائے زریں ہے کہ تمام ملک میں چپہ چپہ پر واقعہ نویس موجود تھے، جن کے متعلق یہ خدمت بھی تھی کہ اربابِ کمال کے وجود سے بادشاہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے، چنانچہ خبر ہونے کے ساتھ ان لوگوں کی جاگیریں مقرر ہو جاتی تھیں، جن کی مال گذاری ان کے لیے معاف ہو جاتی تھی، اس قسم کے بے شمار فرامینِ شاہی خود ہماری نظر سے گذرے ہیں، غرض شیخ حافظ کی بھی جاگیر مقرر ہوگئی اور اس کے متعلق فرمان شاہی عطا ہوا، یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور اس میں (جیسا کہ مولوی ولی اللہ صاحب نے اغصان اربعہ میں لکھا ہے) شیخ کی نسبت نہایت تعظیمی الفاظ مذکور ہیں، شیخ موصوف کی درس گاہ میں طلبہ کی سکونت کا انتظام تھا، جن کے مصارف کا تکفل خود شیخ کی طرف سے کیا جاتا تھا۔

ملا قطب الدین شہید انھیں شیخ حافظ کی نسل سے چوتھی پشت میں تھے، درس نظامیہ کی اصلی بنیاد انھیں سے شروع ہوتی ہے، ملا صاحب کے والد لاہور کے مدرسہ میں مدرس تھے، ملا صاحب نے اسی زمانہ میں ان سے تعلیم پائی، ان کے علاوہ قاضی گھانسی سے علوم حاصل کیے جو بہت بڑے صوفی اور حضرت محبّ اللہ الہ آبادی کے خلیفہ اور جانشین تھے، اس زمانہ میں قصبہ دیوا جو لکھنؤ کے نواح میں ہے مولانا عبدالسلام کے درس کی وجہ سے علم و فضل کا مرکز تھا، ملا صاحب نے وہاں بھی جا کر علم کی تحصیل کی، مولانا عبدالعلی بحر العلوم کے خلف اکبر مولوی عبدالاعلیٰ اپنے رسالہ قطبیہ میں لکھتے ہیں کہ "ان کی تصنیفات میں سے صرف شرح حکمۃ العین کا حاشیہ اور رسالہ امور عامہ کے مسودہ کے کچھ اجزا میرے والد کے کتب خانہ میں موجود ہیں، تلویح کا حاشیہ بھی

ملا نظام الدین کے زمانہ تک موجود تھا مگر اب مفقود ہے۔"

ملا صاحب کا معمول یہ تھا کہ دن کو درس دیتے تھے، شب کو عبادت میں مصروف ہوتے تھے اور سہ شنبہ اور جمعہ کے دن تصنیف کرتے تھے۔(۱)

ملا صاحب کے فضل و کمال کا شہرہ ہوا تو عالمگیر نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، لیکن ملا صاحب نے اپنے اسلاف کے طریقہ کے موافق گوشۂ عزلت کا چھوڑنا گوارا نہ کیا۔(۲)

ملا صاحب نے درس کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا تھا جو خود ان کا قایم کردہ تھا، وہ ہر فن کی صرف ایک جامع اور مستند کتاب پڑھاتے تھے کہ شاگرد کو تمام مسائل پر مجتہدانہ عبور ہو جاتا تھا، رسالہ قطبیہ میں ہے:

> "مولانائے شہید (ملا قطب الدین) از ہر فن یک یک
> کتاب میخوانیدند و شاگردان محقق می شدند"

ملا نظام الدین اور مولانا بحر العلوم نے اس پر اضافہ کیا، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے۔

ملا صاحب کے حلقۂ درس نے نہایت وسعت حاصل کی اور سلسلۂ تلامذہ میں ایسے علما پیدا ہوئے جن کے الگ الگ حلقۂ درس ہو گئے اور تمام ہندوستان پر چھا گئے، ان میں سے چار شخص نہایت نامور ہیں، ملا نظام الدین جن کے نام سے درسِ نظامیہ مشہور ہے، ملا محبّ اللہ بہاری جو بیک واسطہ ملا صاحب کے شاگرد ہیں اور جن کی تصنیف سلم اور مسلم اس قدر مقبول ہوئی کہ آج علما کا سرمایۂ کمال یہی کتابیں اور ان کی شرحیں ہیں، مولوی امان اللہ بنارسی جو ملا نظام الدین کے استاد تھے اور جن کی اصول فقہ میں ایک معرکہ آرا تصنیف ہے، قطب الدین شمس آبادی جو ملا محبّ اللہ بہاری کے استاد تھے۔

---

(۱) رسالہ قطبیہ از مولانا عبدالاعلیٰ درحال ملا قطب الدین شہید (۲) گلزار انصار

ملا صاحب کی شہادت: ملا قطب الدین کی شہادت اگر چہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن سخت تعجب ہے کہ رسالہ قطبیہ، اغصان اربعہ اور سبحۃ المرجان ان سب کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت اجمال سے لکھا ہے، اس لیے ہم عمدۃ الوسائل اور گلزار انصار سے اس کی تفصیل لکھتے ہیں، اگر چہ پچھلی کتاب ایک معمولی درجہ کی تصنیف ہے۔

قصبہ سہالی کے آس پاس خانزادے رہتے ہیں، ان سے اور چودھری محمد آصف سے جو سہالی کے زمیندار اور ملا صاحب کے ابن العم تھے ہمیشہ سرحدی جھگڑے رہتے تھے، ملا صاحب کی شادی چودھری محمد آصف کی لڑکی سے ہوئی تھی، اس تعلق سے خانزادوں کو ملا صاحب سے بھی عداوت ہوگئی، تاہم چونکہ ملا صاحب کی عزت دربار شاہی میں بھی تھی، یہ لوگ کچھ جرأت نہیں کر سکتے تھے، سوء اتفاق یہ کہ خود سہالی میں عثمانی خاندان کے جو شیخ زادے تھے ان سے اور چودھری محمد آصف سے، موضع بلرن کی آب پاشی کے متعلق نزاع ہوئی، اہل شہر ان جزئیات کی وقعت نہیں کر سکتے، لیکن ہم دیہات والے ان مہمات کو ایران و توران کے معرکوں سے کم نہیں سمجھتے، غرض دونوں طرف سے بڑے زور کی تیاریاں ہوئیں لیکن ملا صاحب نے جا کر بیچ بچاؤ کیا اور دونوں طرف کی فوجیں واپس گئیں، موقع پا کر خانزادے کئی سو آدمی کے ساتھ سہالی مین آئے اور عثمانیوں کو جا کر بھڑکایا کہ ہم ساتھ ہیں آپ حملہ کیجیے، سب مل کر چودھری محمد آصف کے گھر پر چڑھ آئے، چودھری صاحب ملا صاحب کے مکان پر تقریب ولادت کی مبارک باد دینے گئے تھے(۱) ظالموں نے جا کر ملا صاحب کے گھر کا محاصرہ کرلیا، دیواروں میں نقب لگا کر گھس گئے، ایک نازک اور کمزور جسم کے لیے ہلکا سا ایک وار کافی تھا لیکن ظالموں نے تمام آلاتِ جنگ استعمال کیے، پہلے تیر، پھر

---

(۱) یہ تفصیل گلزار انصار سے ماخوذ ہے، محضر نامہ میں نہیں ہے، اغصان الانساب اور رسالہ قطبیہ میں ہے کہ مخالفین نے پہلے چودھری آصف کے گھر پر حملہ کیا، وہ ملا صاحب کے پاس اعانت و مشورت کے لیے آئے، مخالفوں نے تعاقب کیا اور ان کے ساتھ ملا صاحب کو بھی شہید کیا۔

بندوق اور آخر تلوار کے سات واروں نے مل کر اس پیکر روحانی کو برباد کرنا چاہا اور اپنے اعتقاد کے مطابق کامیاب بھی ہوئے لیکن

کشتگانِ خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگرست

اس واقعہ کی تاریخ روز دوشنبہ رجب ۱۱۰۳ھ ہے۔

ملا صاحب کے ساتھ چند طلبا نے بھی جو مشغولِ درس تھے وفات پائی، ظالموں نے خوں ریزی سے فارغ ہو کر گھر کا مال واسباب لوٹا اور ملا صاحب کا ذخیرۂ علمی، جس میں سات سو کتابیں تھیں جلا کر برباد کر دیا، ملا صاحب کی لاش اور چودھری آصف کا سر ساتھ لے گئے، تین چار دن کے بعد ملا صاحب کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لیے اور لاش سہالی بھیج دی، چنانچہ ۲۷؍رجب کو نمازِ جنازہ پڑھ کر تجہیز و تکفین کی۔

اس واقعہ میں ملا صاحب کے صاحبزادوں میں سے تین صاحب موجود تھے، ملا سعید، ملا نظام الدین، ملا رضا، ملا سعید زخمی ہوئے اور ملا نظام الدین کو اشقیا پکڑ کر پینتے پور لے گئے لیکن فتح پور اور ردیوا کے شرفا نے جا کر نہایت لجاجت اور الحاح سے ان کی رہائی کرائی، صاحبزادوں نے ایک محضر لکھا جس میں تمام واقعات کی تفصیل لکھی محضر اب تک موجود ہے اور اس پر تمام مشہور علما اور رؤسا اور عمال شاہی کے تصدیقی دستخط ثبت ہیں، چونکہ اس محضر میں تمام واقعات اور قاتلوں کے نام تفصیل سے درج ہیں اس لیے ہم اس کو بعینہٖ نقل کرتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحکم آیہ کریمہ **لاتکتموا الشھادۃ ومن یکتمھا فانہ آثم قلبہ** سوال میکنم و گواہی میخواہم، ماجماعہ ہستم رسیدگان محمد سعید و نظام الدین و محمد رضا پسران مولوی قطب الدین ساکن قصبۂ سہالی سرکار لکھنؤ صوبۂ اودھ از قضاۃِ اسلام و مشائخِ کرام و جمہورِ انام براین معنی کہ براصاغر و اکابر این دیار روشن و ہویداست کہ مولوی مذکور موصوف بکمالاتِ انسانیہ و فضائل علمیہ و عملیہ و حافظ قرآن مجید بودند و غیر اشغالِ

تدرس وتکرار باطلبۂ علوم دینیہ وعبادت وطاعت کارے نداشتند ، ودراوقاتِ فراغ از درس وعبادت، بہ تصنیف درعلم تفسیر وحدیث وفقہ واصول می پرداختند ، بتاریخ رجب المرجب ۱۱۰۳ھ مطابق روز دوشنبہ برعادت قدیمہ ازنماز فجر ووظائف فراغ اندوختہ درمدرسہ آمدہ بدرسِ جمعے ازفضلاے حاضر الخدمت مشغول شدند، چون دوگھڑی روز برآمد اسداللہ وباقر و پیرمحمد سکنہ روضہ عملہ پرگنہ سہالی ونوروغلام محی الدین بساون و سہاون ساکنان قصبہ سہالی وفقیر اللہ متوطن قصبہ دیواوانور ساکن استی معمولہ پرگنہ بجنور وغیرہ زمینداران گردوپیش خانۂ مولوی رامحاصرہ نمودندواز ہرچہار طرف دیوارنقبہا زدہ اندرون درآمدند ومولوی رایک زخم تیرویک زخم تفنگ وہفت ضرب شمشیر برورسانیدہ شہید ساختند وشیخ غلام محمد نبیرہ زبدۃ الاولیاء بندگی شیخ نظام الدین ساکن امیٹھی ودیگر شیخ شرف اللہ ساکن سندیلہ کہ بخواندن فاتحۃ الفراغ درخدمت بودند، نیز از دستِ ظلمہ مذکورین شہید شدند، ومحمد آصف چودھری پرگنہ سہالی کہ براے مدد مولوی رسیدہ باہمراہیان خود شہید شدند، بندہ محمد سعید وجمعے از طلبہ وشیخ فضل اللہ برادرنائب قاضی عبداللہ قاضی پرگنہ سہالی وغیرہ زخمی شدند، پس از آنکہ ظلمۂ مذکورین ازقتل ونکل فارغ شدند، بہ نہب اموال وامتعہ کہ درحویلی بود پرداختند ، چنانچہ اثرے ازان نگذاشتہ و کتب مولوی وغیرہ ازمردم کہ قریب نہصد جلد مجتمع بود اکثرے ازان آتش دادہ سوختند ، درآن میان مصحف مجید چہار جلد ومشکوٰۃ وغیرہ ازکتب حدیث ومصنفاتِ مولوی حاشیہ تلویح وشرح عقائد نسفیہ وتعریفات بزدوی وحاشیہ مطول وغیرہ کتب کہ کثیر الحجم مشتمل برفوائد جمیلہ بودند ہمہ سوختہ شد وہمہ را برداشتہ بردند بامستوران مولوی و برادران بانواع ہتک حرمت پیش آمدندازان برخانۂ شیخ حسام الدین برادرعم زادِ حقیقی مولوی وغیرہ برادران ومردم غرباسکنہ قصبہ سہالی برریختید ، مال ومتاع ہرچہ بود بغارت بردند، چون وقت دوپہر ازکارہاے مسطورفارغ شدند، ومراجعت بمسکن خود کہ موضع پیلتے پور معمولہ پرگنہ فتح پور دیواوغیرہ باشد نمودند، بندہ نظام الدین پسرخورد مولوی را اسیر کردہ

ہمراہ گرفتند، ونعش مولوی وسر محمد آصف چودھری نیز باخود ہا بموضع مذکور بردند، بعد از سہ چہار روز از الحاح و عجز بعضے شرفاے فتحپور و دیوابندہ نظام الدین را خلاص نمودند، وسر محمد آصف دادند ونعش مولوی را جا بجا مدفون میکردند ومی برآوردند، آخر بعد نہ روز ہر دو دست بریدہ گرفتند ونعش بہ قصبہ سہالی فرستادند، چنانچہ جمع از مسلمین نماز جنازہ خواندہ بتاریخ بست وہفتم شہر مذکور در قصبہ سہالی مدفون ساختند''۔

تذکروں میں دشمنوں کی مخالفت کی کوئی خاص وجہ ملا صاحب سے نہیں ہے اورصرف آصف چودھری کی پناہ گزینی ایسی بے رحمی اور سفاکی کا سبب نہیں ہوسکتی، عمدۃ الوسائل میں لکھا ہے کہ مخالفین اپنی زمینداری میں نہایت ظلم کرتے تھے اور چونکہ عالمگیر ملا قطب الدین سے بہت راہ ورسم رکھتا تھا اور امراے دربار کوان کی خدمت میں بھیجتا رہتا تھا، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ ہمارے مظالم بادشاہ تک پہنچ جائیں گے ملا سعید یہ محضر لے کر عالمگیر کے پاس دکن گئے، عالمگیر نے عمال کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلوں سے قصاص لیا جائے اوران کا خان ومان برباد کردیا جائے (۱) چنانچہ صوبہ دار لکھنؤ نے سرکاری سپاہ بھیج کر ان کا گھربار غارت کردیا، مخالفین بھاگ کر جلاوطن ہوگئے اور بالآخر خاندان والوں نے جعلی فوتی نامہ بنا کر عالمگیر کے وربار میں پیش کیا کہ قاتل مرگئے، اصل قاتل اسداللہ تھا، جوموضع پینتی پور کا رہنے والا تھاوہ گوروپوش ہوکر بچ گیا، لیکن مدت تک زندہ رہا، چنانچہ ملا نظام الدین (پسر ملا قطب الدین شہید) کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، اس نے ملا صاحب کی خدمت میں خون بہا بھی پیش کیا لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ اپنا حصہ معاف کردیا، تاہم خون کا یہ اثر تھا کہ جب وہ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو آپ اس کی طرف سے منھ پھیر لیتے تھے (۲) مولوی ولی اللہ صاحب عمدۃ الوسائل میں لکھتے ہیں کہ میں نے ۱۲۰۹ھ میں پینتی پور جا کر دیکھا تو ویران اور تباہ تھا اور گاؤں والے کہتے تھے کہ یہ اسی

(۱) اغصان اربعہ مطبوعہ مطبع کارنامہ لکھنؤ (۲) رسالہ قطبیہ

خونِ ناحق کی سزا ہے۔

عالمگیر نے ملا قطب الدین کے صاحبزادوں کے رہنے کے لیے فرمان کے ذریعہ سے لکھنؤ میں دو مکان عنایت کیے، یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے اور ہم اس کے جستہ جستہ حصے نقل کرتے ہیں:

''درین وقت میمنت اقتران والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ یکمنزل حویلی فرنگی محل با متعلقہ آن واقع بلدہ لکھنؤ مضاف بہ صوبہ اودھ کہ از امکنۂ نزولی ست برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسرانِ ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران و کروریاں آنرا بنام مشار الیہما معاف و مرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم ومتعرض نہ شوند واندرین باب سند مجدد نہ طلبند مرقوم غرہ ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد''۔

فرمان کے پشت پر جو عبارت ہے اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:

''شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنج شنبہ ۱۴ر شعبان المعظم ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق مرداد ماہ برسالہ صدارت و مشیخت پناہ، فضیلت و کمالات دستگاہ، سزاوارِ مرحمت و احسان، صدر منبع القدر فاضل خان و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلایق پناہ حسام الدین حسین قلمی می گردد کہ بعرض مقدس و معلیٰ رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسرانِ ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبہ مذکور را گذاشتہ جلاوطن گردیدند و کدام مکان باسکونت ندارند الخ''

ملا صاحب کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی اور فرمان کی تاریخ تحریر شعبان

۱۱۰۵ھ ہے، چونکہ عالمگیر اس زمانہ میں دکن میں تھا، اس لیے ملا سعید کو وہاں پہنچتے اور حکم صادر ہوتے ہوتے دو برس کا زمانہ گذرا، غرض فرمان کے بعد سارا خاندان لکھنؤ میں آگیا اور فرنگی محل دار العلم والعمل بن گیا۔

اس محلّہ کی وجہ تسمیہ یہ مشہور ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلّہ میں آکر تجارت کے تعلق سے رہا تھا، وہ وطن چلا گیا تو اس کے مکانات سرکاری قبضہ میں آگئے اور وہی اسلامی علوم کی یونی ورسٹی بن گئی۔

بہ بین کرامت بت خانۂ مرا اے شیخ   کہ چون خراب شود خانۂ خدا گردد

ملا صاحب کے چار صاحبزادے تھے، ملا اسعد، ملا سعید، ملا نظام الدین، ملا رضا۔ ملا اسعد سب میں بڑے تھے اور بہت بڑے عالم تھے، حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ لکھا تھا، ملا جیون سے مناظرہ میں فتح حاصل کی، مزاج امیرانہ تھا، اس لیے دربار میں توسل پیدا کیا اور ہمیشہ عالمگیر کے ہمرکاب رہتے تھے، شاہ عالم کے زمانہ میں وفات پائی (۱) ملا حسن جو مشہور عالم گذرے ہیں انھیں کے پوتے تھے۔

دوسرے صاحبزادے ملا سعید باپ کے ساتھ زخمی ہوئے تھے، اچھے ہوکر دکن گئے اور فرنگی محل کی معافی کا فرمان لائے، عنفوانِ شباب میں وفات کی، ملا احمد عبدالحق جو مشہور صوفی اور مصنف گذرے ہیں انھیں کے صاحبزادے ہیں، مولوی مبین شارح سلم انھیں کے فرزند تھے۔

تیسرے صاحبزادے ملا نظام الدین تھے، ان کا حال تفصیل سے آتا ہے۔

چوتھے صاحبزادے ملا محمد رضا، ملا نظام الدین سے سات برس چھوٹے تھے، یہ بھی بڑے عالم تھے، مسلم پر شرح لکھی لیکن اخیر میں درس و تدریس کا سلسلہ چھوڑ کر شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر مرید ہوئے اور تارک الدنیا ہوگئے۔

ملا نظام الدین کی عمر باپ کی شہادت کے وقت ۱۴ / برس کی تھی اور شرح

(۱) رسالہ قطبیہ

ملا جامی تک پڑھ چکے تھے، لکھنؤ میں آ کر طالب العلمی میں مشغول ہوئے، ابتدائی کتابیں دیوا میں جا کر پڑھیں جو آج حاجی وارث علی صاحب مرحوم کے انتساب سے مشہور ہے اور اس زمانہ میں مولانا عبدالسلام کا درس گاہ تھا پھر اکثر کتابیں جائس میں جا کر ملا علی قلی سے پڑھیں، امور عامہ مولانا امان اللہ بناری سے پڑھا، قوشجیہ کی تحصیل ملا نقشبند گورکھپور سے کی (۱) مولوی غلام علی آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں کہ آخری کتابیں ملا غلام علی نقشبندی سے لکھنؤ میں پڑھیں، زمانہ کا انقلاب دیکھو آج جائس اور دیوا معمولی دیہات ہیں، ایک زمانہ تھا کہ وہ ملا نظام الدین کے قبلۂ مقصد تھے، غرض ملا صاحب نے ۲۴ برس کی عمر میں تمام علوم وفنون سے فراغت حاصل کی۔

سلسلۂ قطبیہ میں یوں تو سیکڑوں علما پیدا ہو گئے لیکن ملا نظام الدین کے نام کو خدا نے وہ عزت دی کہ آج سب کا نام انھیں کے نام سے روشن ہے اور ہندوستان کا تمام سلسلۂ درس انھیں کے نام سے منسوب ہے، مولوی غلام علی آزاد مآثر الکرام میں لکھتے ہیں ''امروز علماے اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند وکلاہ گوشۂ تفاخر می شکنند وکسیکہ سلسلۂ تلمذ بہ اورساند بین الفضلاء علم امتیازمی افرازد''، وہ علم وفضل کے ساتھ زہد وقناعت، صبر ورضا، تقدس اور ایثارِ نفس کے وجودِ مجسم تھے، ان کی تصنیفات بھی کثرت سے ہیں لیکن یہ بھی ان کا ایثار نفس ہے کہ سلسلۂ درس میں اپنی ایک تصنیف بھی نہیں رکھی، بلکہ اپنے استاد بھائی، ملا محبّ اللہ بہاری کی کتابیں سلم ومسلم درس میں داخل کیں، جس کی بدولت آج ان کتابوں کا نام آفتاب وماہتاب کی طرح روشن ہے۔

ملا صاحب نے چالیس برس کی عمر میں شاہ عبدالرزاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر تصوف کا رنگ ان پر غالب آ گیا، ملا صاحب کا بالا خانہ جس پر بیٹھ کر درس دیا کرتے تھے آج بھی موجود ہے، میں نے ۱۸۹۹ء میں اس کی زیارت کی تھی، ۹ر جمادی الاولیٰ ۱۱۶۸ھ میں سنگ مثانہ کی بیماری میں وفات پائی۔

---

(۱) یہ تفصیل اغصان الانساب میں ہے۔

عبدالباسط امیٹھوی نے تاریخ لکھی:

نظام الدین محمد واصل حق چو از روے زمین سوے فلک شد
وصالِ سالِ تاریخش فلک گفت ملک بود و بیک حرکت ملک شد(۱)

تصنیفات حسب ذیل ہیں:

شرح منار، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیۂ حاشیہ قدیمہ، شرح عقائد نسفیہ، شرح مسلم، شرح تحریر الاصول، حاشیہ صدرا۔

ملا صاحب نے نہایت زہد وقناعت کی زندگی بسر کی، کبھی کبھی تین تین دن کا فاقہ گذر جاتا تھا، اکثر چنے چاب کر رہ جاتے تھے، کبھی اہل دنیا کی طرف توجہ نہ کی، مناظرہ اور مجادلہ جو علما کا عام طریقہ ہے، اس سے پرہیز کرتے تھے، ان کے طلبہ میں اگر کوئی کسی کو بحث میں الزام دیتا تھا تو اس سے ناراض ہوتے تھے، چونکہ میں نے ملا صاحب کا حال معارف میں تفصیل سے لکھا ہے، اس لیے یہاں قلم انداز کرتا ہوں۔

مولانا عبدالعلی بحرالعلوم: ملا صاحب کی پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ تھی، لوگ کہتے تھے کہ دوسری شادی کیجیے، فرماتے تھے کہ میں بکھیڑے میں پڑنا نہیں چاہتا، ہاں کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوری ہے، میر اسماعیل بلگرامی سے ملا صاحب نے فیض باطنی حاصل کیا تھا، انھوں نے کہلا بھیجا کہ مجھ کو الہام سے معلوم ہواہ کہ دوسری شادی سے تمہارے اولاد ہوگی، غرض اخیر سن میں قصبہ سترکھ میں شادی کی، جس سے وہ گوہرِ شاہوار پیدا ہوا جو آج بحرالعلوم کے نام سے مشہور ہے۔

بحرالعلوم نے جن کا اصلی نام عبدالعلی ہے، تمام کتابیں ملا صاحب ہی سے پڑھیں، اس وقت ان کا سن ۱۷سال کا تھا، اسی زمانہ میں ملا صاحب نے ان کی شادی قصبہ کاکوری میں کردی، ملا صاحب کی وفات کے بعد بحرالعلوم نے ملا کمال سے استفادہ کیا جو ملا نظام الدین کے شاگردوں میں سب سے ممتاز تھے۔

آغازِ شباب تھا کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ان کو وطن چھوڑنا

---

(۱) رباعی عمدۃ الوسائل میں نقل کی ہے اور شاعر کا نام اغصان الانساب میں لکھا ہے۔

پڑا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سید نور الحسن خان صاحب بلگرامی ایک بزرگ شیعی مذہب تھے، وہ اس زمانہ میں بیمار تھے اور مولوی محبّ اللہ صاحب کے مکان پر جو مولوی مبین شارحِ سلم کے والد تھے مقیم تھے، محرم کا زمانہ آیا تو بیماری کی وجہ سے خود تعزیہ کی زیارت کو نہ جاسکے اور کہلا بھیجا کہ تعزیہ کو اسی طرف سے لے جائیں تاکہ میں یہیں سے زیارت کرلوں، مولانا بحر العلوم کا مدرسہ سرِ راہ تھا اور اتفاق یہ کہ اس وقت مولانا محرم کے شربت پر فاتحہ دے رہے تھے، ان کو معلوم نہ تھا کہ بلگرامی صاحب کے حسب طلب تعزیہ آیا ہے، چونکہ فاتحہ میں مصروف تھے زبان سے نہ بولے، ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ادھر سے راستہ نہیں، طلبہ موجود تھے سمجھے تعزیہ کے توڑنے کا حکم دیا، اٹھ کر تعزیہ توڑ پھوڑ ڈالا، یہ نوابانِ اودھ کا زمانہ اور شیعیت کا زور تھا، غل پڑ گیا کہ مولانا نے بغاوت کی، قاضی غلام مصطفیٰ جو شیعی مذہب تھے، بلوہ عام کرکے مولانا کے گھر پر چڑھ آئے، مولانا نے بھی سیکڑوں ہزاروں آدمی جمع کر لیے اور مقابلہ کی تیاری کی، یہ سامان دیکھ کر قاضی صاحب نے صلح کی درخواست کی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا، لیکن یہ محض وقع الوقتی تھی، قاضی صاحب چاہتے تھے کہ بے خبری میں مولانا کو قتل کرادیں، مولانا نے اہل خاندان سے مشورت کی، حکومت کا مقابلہ کون کرسکتا تھا، لوگوں نے کہا مصلحت یہ ہے کہ آپ کچھ دنوں کے لیے ٹل جائیں، لیکن مولانا کے احباب نے کہا کہ ملا نظام الدین صاحب کی نشست گاہ سے نکلنا ٹھیک نہیں، آپ یہیں رہیں ہم لوگ سینہ سپر ہوں گے، لیکن خاندان کے لوگ خود مولانا کا عروج نہیں دیکھ سکتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ پتھر سینہ سے ٹل جائے، ان لوگوں نے کہا آپ اپنے ساتھ ہم کو نہ برباد کرائیے، مولانا کے رفقا اب بھی راضی نہ تھے لیکن مولانا چھپ کر گھر سے نکلے اور شاہجہاں پور چلے آئے، یہاں حافظ رحمت خان کی حکومت تھی، اس نے بڑی تعظیم و تکریم کی، مولانا نے ۲۰ رسال تک یہاں قیام کیا۔(۱)

---

(۱) یہ پوری تفصیل رسالہ قطبیہ میں ہے اور چونکہ یہ خود مولانا کے خلف اکبر کی تحریر ہے، اس لیے اس سے زیادہ قابل اعتماد اور کوئی شہادت نہیں ہوسکتی۔

حافظ رحمت خان نے مولانا کے مصارف کے لیے معقول رقم مقرر کردی اور ان کے طلبہ کے وظائف مقرر کرادیئے، نواب عبداللہ خان رئیسِ شاہجہاں پور نے قلعہ میں لے جا کر اپنے مکان میں اتارا، دور دور سے طلبہ مولانا کا نام سن کر آنے لگے اور بہت بڑی درس گاہ قایم ہوگئی، بہت سے لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے، یہاں مولانا نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، حافظ رحمت خان نے جب شہادت پائی تو یہ اطراف نواب شجاع الدولہ کی حکومت میں آگئے تو مولانا نے یہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا، اس زمانہ میں رامپور کی ریاست پر نواب فیض اللہ خان حکمراں تھے، وہ خود آکر مولانا کو ساتھ لے گئے، چند روز تک مولانا نے یہاں قیام کیا لیکن نواب موصوف مولانا کے گروہِ طلبہ کی کفالت نہ کر سکے اور مولانا نے یہاں سے بھی نکلنے کا ارادہ کیا، اس زمانہ میں منشی صدرالدین خان نے بوہار میں جو کلکتہ کے نواح میں ہے ایک مدرسہ قایم کیا تھا، مولانا کے پاس زادِ راہ بھیج کر تشریف لانے کی درخواست کی، مولانا سو شاگردوں کے ساتھ بوہار کو روانہ ہوئے، قریب پہنچے تو منشی صدرالدین خان خود استقبال کر کے لائے، چار سو تنخواہ مقرر کی اور مولانا کے تمام شاگردوں کے وظائف مقرر کردیئے۔

یہ واقعات اغصان اربعہ سے منقول ہے لیکن رسالۂ قطبیہ میں ہے کہ مولانا کو رام پور میں کچھ شکایت کی وجہ نہیں پیدا ہوئی تھی، لیکن منشی صدرالدین خان کے سخت اصرار کی وجہ سے مجبور ہوگئے، قطبیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ منشی صدرالدین خان نے افسرانِ انگریزی کی سفارشیں بھی نواب فیض اللہ خان کے پاس بھجوائیں کہ وہ مولانا کو ادھر روانہ کردیں۔

بہرحال مولانا نے بوہار میں کچھ زمانہ تک قیام کیا، یہ وہ زمانہ ہے کہ مدراس میں نواب والا جاہ محمد علی خان والیٔ ارکات کی حکومت تھی، وہ خاص قصبۂ گوپامئو کے رہنے والے تھے، اس تعلق سے مولانا کے ہم موطن تھے، مولانا بعض اسباب کی وجہ

سے بوہار سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، یہ خبر نواب کو پہنچی، فوراً درخواست بھیجی، مولانا بوہار سے روانہ ہوئے، مدراس کے قریب پہنچے تو نواب نے اعزہ خاندان اور امرائے دربار کو ایک منزل آگے استقبال کے لیے بھیجا، شہر میں داخل ہوئے تو سب امرا جلو میں ساتھ ساتھ تھے، ڈیوڑھی کے قریب پالکی پہنچی تو نواب مع تمام مقربین کے پیادہ نکلا، مولانا نے پالکی سے اترنا چاہا، نواب نے دوڑ کر پالکی میں کاندھا دیا اور اسی طرح مکان کے صحن تک لایا، دربار میں جہاں خود اس کی نشست تھی مولانا کو اس جگہ بٹھایا اور مولانا کے قدم چومے اور کہا اللہ اکبر یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے گھر میں آتا۔(۱)

اغصان الانساب میں لکھا ہے کہ مولانا بوہار سے اٹھ کر پہلے کلکتہ میں آئے، یہاں نظام حیدرآباد اور سلطان حیدر (ٹیپو سلطان کا باپ) کی متعدد عرضیاں آئیں کہ یہاں قدم رنجہ فرمایئے لیکن چونکہ ہم وطنی کا واسطہ تھا اس لیے مولانا نے مدراس کو ترجیح دی۔

نواب محمد علی خان نے مولانا کو ایک نہایت عمدہ محل رہنے کو دیا اور روزانہ اپنے باورچی خانہ سے کھانا بھجواتا تھا، جب کبھی مولانا اس کے ملنے کو جاتے تھے تو اسی پہلے دستور کے موافق استقبال اور تعظیم کرتا، چند روز کے بعد ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، مولانا کی بیش قرار تنخواہ مقرر کی، طلبہ کے وظیفے مقرر کیے، مولانا اب اسی مدرسہ میں طلبہ کے ساتھ رہنے لگے۔

نواب محمد علی خان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے عمدۃ الامرا مسند نشین ہوئے، خاندان میں مسند نشینی کے متعلق نزاع کا احتمال تھا لیکن مولانا نے جب ان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا تو سب نے گردنِ اطاعت خم کردی، عمدۃ الامرا نے باپ سے بھی زیادہ عزت وحرمت کی، مولانا کے علاوہ ان کے خاندان کے لیے الگ ماہواریں

(۱) یہ پوری تفصیل اغصان اربعہ میں ہے۔

مقرر کیں، عمدۃ الامرا کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کے بیٹے کو مسند نشیں کیا، لیکن چونکہ مولانا اس کے عقائد اور مذہب کی طرف سے مطمئن نہ تھے، خود اس رسم میں شریک نہ ہوئے، چونکہ اس نے اہل خاندان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، لوگوں نے شکایت کی، بالآخر چھ مہینے کے بعد انگریزوں نے اس کو معزول کر دیا اور عظیم الدولہ کو جو نواب محمد علی خان کے بڑے بیٹے تھے مسند نشیں کیا، عظیم الدولہ مولانا کے شاگرد خاص تھے، عظیم الدولہ کی نوابی برائے نام تھی، کیونکہ گورنمنٹ انگریزی نے ملک اس کے قبضہ سے نکال کر روزینہ مقرر کر دیا تھا، لیکن عظیم الدولہ نے مولانا کی ماہوار جاری رکھی۔

اب مولانا کی عمر ۸۳ برس کی ہو چکی تھی اور ضعف غالب آتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ۸؍رجب ۱۲۳۵ھ میں مرض الموت میں گرفتار ہوئے، چار دن تک یہ حالت رہی کہ کبھی کبھی ہوش آجاتا تھا، پھر غشی طاری ہو جاتی تھی، ہوش کی حالت میں چند بار فرمایا کہ نفی و اثبات کی حقیقت اب معلوم ہوئی، خدا کے سوا کوئی چیز موجود نہیں، ۱۲؍رجب کو انتقال کیا۔(۱)

مولانا کے اخلاق و عادات کی سب سے نمایاں صفت فیاضی اور دریا دلی تھی ہمیشہ نہایت فارغ البال رہے لیکن جو کچھ آتا تھا احباب اور فقرا کو تقسیم کر دیتے تھے، اس وجہ سے اہل و عیال نہایت تنگی سے بسر کرتے تھے، لکھنؤ سے بار بار اپنی عسرت اور تنگ حالی کی شکایت لکھتے تھے لیکن مولانا کچھ خیال نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی نواب کو خبر ہو جاتی تھی تو وہ براہِ راست بھیج دیتا تھا۔

مزاج میں اپنے والد کے خلاف ادعا اور تمکنت تھی، کسی سے دبتے نہ تھے، مناظرہ کے بہت شایق تھے، ان سے زیادہ سن و سال کے جو علما تھے ان سے مباحثہ کرتے تھے، لکھنؤ میں جب شیعوں نے ان کے مقابلہ میں بلوہ کرنا چاہا تو ایک گروہِ کثیر

(۱) اغصان اربعہ

ساتھ لے کر مقابل ہوئے اور آخر حریف کو ہٹ جانا پڑا، تصنیفات میں بھی اندازِ طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے۔

مولانا کے تین صاحبزادے تھے، ان کے حالات تفصیل سے لکھے جا سکتے ہیں، لیکن یہ مضمون ایک کتاب بن جائے گی۔

سلسلہ نظامیہ کی علمی حالت پر ایک عام اجمالی نظر: اس خاندان نے علم وفن کے ترقی دینے میں جو جو کام کیے ان کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے، میں مختصراً بعض اہم باتیں لکھتا ہوں۔

۱-سب سے پہلے یہ کہ اتفاق سے یہ خاندان کثیر الافراد تھا، ملا قطب الدین شہید کے چار صاحبزادے تھے، ان سب سے خاندان پھیلے اور ہر طبقہ میں کثرتِ اولاد رہی، مولوی عبدالباری صاحب نے ایک رسالہ آثار الاول نام لکھا ہے، جو شائع ہو چکا ہے، وہ گویا اسی خاندان کی انسائیکلو پیڈیا ہے، اس میں سیکڑوں بزرگوں کے نام اور مختصر حالات لکھے ہیں، ان بزرگوں میں اکثر صاحب علم اور صاحب تصنیفات تھے، یہاں تک کہ اگر ان سب کی تصنیفات جمع کی جائیں تو ایک کتب خانہ بن جائے گا، میرے زمانہ تک جو شاہیر زندہ تھے ان کے یہ نام ہیں: مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا نعمت اللہ ریاضی داں، مولانا عبدالحلیم، مولانا محمد نعیم، مولانا عبدالحئی، مولوی فضل اللہ، ان بزرگوں کے تلامذہ سیکڑوں اور ہزاروں سے متجاوز تھے، جن میں بہت سے خود بڑے بڑے سلسلۂ درس کے مالک تھے، خاکسار کو بھی اس سلسلۂ شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

ہندوستان میں جس قدر اور جہاں جہاں بڑے بڑے سلسلۂ درس قائم ہوئے اکثر اسی خاندان کا فیض ہے مثلاً پورب میں محبّ اللہ بہاری اور غلام یحییٰ بہاری سے علم پھیلا، دونوں اسی خاندان کے شاگرد ہیں، رام پور میں ایک زمانہ تک درس گاہِ عام تھا یہ مولانا بحر العلوم اور ملا حسن کا فیض تھا کیوں کہ یہ دونوں بزرگ ایک مدت تک یہاں رہے تھے اور ملا حسن نے رام پور ہی میں وفات پائی، نجیب الدولہ نے دارانگر

میں جوامروہہ کے قریب ہے، ایک مدرسہ قایم کیا تھا جس میں نہایت کثرت سے طلبہ نے تعلیم پائی، اس مدرسہ کے اکثر مدرسین اسی خاندان کے شاگرد تھے۔

بنگال اور مدراس میں جو کچھ علم پھیلا وہ مولانا بحرالعلوم کا فیض ہے کہ ان مقامات میں آپ نے قیام فرمایا تھا، یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ یہ خاندان اگر دنیا کی طرف متوجہ ہوتا تو جاہ ومنصب کی کمی نہ تھی، چنانچہ بعض بعض نے اتفاقاً ادھر کا رخ کیا تو بڑے بڑے عہدے حاصل کیے مثلاً مولوی غلام یحییٰ اور مولوی غلام محمد صدر الصدور تھے، نور یہ سلسلہ نے حیدر آباد میں نہایت عظمت حاصل کی لیکن من حیث الاغلب اس خاندان نے علم وفن کو مقصدِ زندگی قرار دیا، فقر و فاقہ میں بسر کی اور اس میں عمریں گذار دیں، یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں اور جو علمی خاندان تھے مثلاً دلی میں شاہ ولی اللہ، الہ آباد میں شاہ محمد افضل صاحب کا دائرہ، بہار میں ملا محبّ اللہ، جونپور میں ملا محمود جونپوری، بلگرام میں عبدالجلیل بلگرامی، غلام علی آزاد، یہ سب خاندان دو دو تین تین پشت سے زیادہ نہ چلے یعنی وہ علمی حیثیت قایم نہ رہی لیکن فرنگی محل کا خاندان دوسو برس تک ایک حیثیت سے قایم رہا اور سیکڑوں علما وفضلا پیدا ہوئے۔

۲- آج تمام ہندوستان میں جو نصابِ تعلیم جاری ہے اس میں اکثر کتابیں اسی علمی سلسلہ کی تصنیفات ہیں، سلم ملا محبّ اللہ بہاری کی تصنیف ہے، جو ملا قطب الدین کے شاگرد تھے اس کی تین شرحیں داخل درس ہیں، وہ سب اسی خاندان کی یا ان کے شاگردوں کی تصنیف ہیں، میرِ زاہد پر غلام یحییٰ کا حاشیہ درس میں داخل ہے، وہ بیک واسطہ کمال کے شاگرد تھے۔

۳- ایک مدت سے درس کا جو طریقہ چلا آتا تھا اس خاندان نے اس کو بدل دیا اور اس میں مناسب اصلاح کی، اس خاندان سے پہلے ہر فن میں متعدد اور کثرت سے کتابیں درس میں داخل تھیں، ملا قطب الدین شہید نے یہ طریقہ قایم کیا کہ ہر فن کی صرف ایک مختصر اور جامع کتاب مقرر کی، ملا نظام الدین نے ایک ایک کتاب کا

اضافہ کیا یعنی ہر فن کی دو دو کتابیں لیں، اس طرح ایک بڑا طور مار کم ہوگیا، مثلاً پہلے منطق میں شرح مطالع پڑھاتے تھے، ملا صاحب نے بجائے اس کے قطبی رکھی جو اس سے بہت مختصر ہے، حاشیہ قدیمہ و جدیدہ وغیرہ جس کو ملا فتح اللہ نے ہندوستان میں رواج دیا تھا سب اٹھا دیا۔

یہ امر خاص طور پر اظہار کے قابل ہے کہ آج جس چیز کو لوگ درس نظامیہ کہتے ہیں اور اس نام کی وجہ سے نہایت سختی کے ساتھ اس پر اڑے ہوئے ہیں، اس کا بڑا حصہ درسِ نظامیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا مثلاً حمد اللہ، ملاحسن آج درس میں داخل ہیں، یہ کتابیں ملا نظام الدین صاحب کے زمانہ میں تصنیف بھی نہیں ہوئی تھیں، قاضی مبارک بھی درس میں داخل نہ تھی، غلام یحییٰ کا مطلق پتہ نہ تھا، اس کے علاوہ متعدد کتابیں جو اس وقت درس میں داخل تھیں اب اڑا دی گئیں، مولوی عبدالاعلیٰ (خلف اکبر مولانا بحرالعلوم) نے اپنے زمانہ کا جو سلسلۂ درس بتایا ہے، اس میں شرح حکمۃ العین داخل ہے، حالانکہ آج کل بالکل متروک ہے، اسی طرح انھوں نے فن موسیقی کو بھی داخلِ درس رکھا ہے حالانکہ آج اس فن کا نام لینا بھی گناہ ہے۔

درس نظامیہ کا اصول کیا تھا: درسِ نظامیہ میں اصولِ ذیل ملحوظ رکھے گئے۔

۱- اختصار یعنی ہر فن کی ایک دو مختصر کتابیں لے لی گئیں۔

۲- اختصار کے اصول پر اکثر کتابیں، ناتمام درس میں رکھی گئیں یعنی صرف اس قدر حصہ لیا گیا جو ضروری خیال کیا گیا مثلاً میر زاہد ملا جلال، صدرا، شمس بازغہ، مسلم، تلویح، ان سب کتابوں کے کچھ کچھ حصے درس میں داخل ہیں۔

۳- ہر فن میں وہی کتاب رکھی ہے جو اس فن کی سب سے مشکل کتاب ہے، اس سے مقصد یہ تھا کہ غور کی قوت پیدا ہو جائے کہ پھر جس کتاب کو چاہے دیکھ کر سمجھ سکے۔

۴- منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی یعنی اس میں کسی اور فن کی آمیزش نہ تھی،

ملامحبّ اللہ نے اس میں فلسفہ کے مسائل ملادئے اور اس کا عام انداز بدل دیا، یہ کتاب ملا نظام الدین صاحب نے درس میں داخل کی پھر ملا صاحب کے شاگردوں نے اس پر شرحیں لکھیں اور ان میں فلسفہ کا اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا، یہ سب کتابیں درس میں داخل ہوتی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج منطق کی بہت سی کتابیں پڑھ کر بھی منطق نہیں آتی کیوں کہ جس کو منطق سمجھتے ہیں وہ منطق نہیں بلکہ فلسفہ ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دو عالم جو باہم بحث کرتے ہیں تو ان کی تقریر منطقی قواعد سے بالکل الگ رہتی ہے، اسی طرح اصولِ فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا، ملامحبّ اللہ نے اس میں بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا اور اب اصول بھی گویا فلسفہ ہے۔

ہندوستان میں علم وفن کا رواج گو چھ سو برس سے ہے لیکن زیادہ تر منقولات کا رواج تھا، منطق وفلسفہ صرف قطبی تک پڑھاتے تھے، سب سے پہلے مولانا عبداللہ ملتی المتوفی ۹۲۲ھ نے منقولات کی ترویج کی (۱) ان کے بعد قطب الدین شہید اور ان کے خاندان نے معقولات کو ترقی دی، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علما میں وہ سختی کم ہوگئی جو فقہا میں عموماً ہوتی ہے، فتاویٰ عالمگیری میں تکفیر کا باب اٹھا کر دیکھو اس کے مقابلہ میں مولانا بحر العلوم نے ارکان اربعہ میں امامت کی بحث میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مقابلہ کرو تو زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا۔ (الندوہ ج ۷ نمبر ۱۲ دسمبر ۱۹۱۰ء)

---

(۱) مآثر الکرام

ندوہ اور نصابِ تعلیم

ندوہ کے قایم ہونے کی سب سے بڑی ضرورت جوظاہر کی گئی اور واقعی تھی بھی، وہ نصابِ تعلیم کی اصلاح تھی، ندوہ کے مقاصد میں یہ اہم المقاصد تھا اور آج تک ندوہ کے جتنے اجلاس ہوئے اس مقصد کو ہمیشہ نہایت بلند آہنگی سے بیان کیا گیا، لیکن یہ امر بظاہر نہایت تعجب انگیز ہے کہ پارسال تک جو نصاب جاری تھا وہ قریباً وہی قدیم نصاب تھا جو دیوبند وغیرہ میں جاری ہے۔

اس کی وجہ بہت بڑی یہ ہے کہ اصلاحِ نصاب کا خیال صرف چند روشن خیال علما کے دل میں پیدا ہوا ہے، باقی تمام لوگ اسی لکیر کے فقیر ہیں اور چونکہ فیصلہ عموماً کثرتِ رائے پر ہوتا ہے، اس لیے انھیں بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے۔

اس سے بڑھ کر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لیے وہ جدید نصاب (جس میں قدما کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی ہیں ان کے بیسیوں حاشیے موجود ہیں، اس لیے ان کا پڑھ لینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے، لیکن جدید نصاب میں ان کے بجاے دلائل الاعجاز عبد القاہر جرجانی رکھی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ فنِ بلاغت کی جان ہے اور مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چیں ہیں لیکن نہ ہمارے مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا، نہ اس پر شرحیں اور حاشیے موجود ہیں، اس لیے یہ لوگ اس کے پڑھانے سے عاجز ہیں اور چونکہ اپنے عجز کا تسلیم کرنا کسرِ شان ہے اس لیے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس قسم کی کتابوں سے کافی

استعداد پیدا نہیں ہوتی، بہرحال سالِ حال میں یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے اجرا کے ساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفا دیا اور اب اخبارات وغیرہ میں مضامین شایع کیے جا رہے ہیں کہ جدید نصاب درس کے قابل نہیں، بے شبہ اس نئے راستہ کے اختیار کرنے میں نہایت مشکلات پیش آئیں گی، لیکن اگر ندوہ میں اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہیں کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے تو اس کو سرے سے اصلاحِ نصاب کا نام لینا نہ چاہیے، یہ سخت بد دیانتی ہے کہ تمام دنیا میں اصلاحِ نصاب کا غل مچایا جائے اور ایک ذرہ اصلاح نہ کی جائے۔

ہم نے اسی خیال سے اصلاحِ نصاب کے متعلق ایک سلسلہ وار مضمون شروع کیا ہے، جس کا پہلا نمبر آج کے پرچے میں درج ہے۔

نصابِ تعلیم

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے کہ ہندوستان میں ہمارے علمی تنزل کا اصلی سبب کیا ہے، اس کے مختلف جواب دئے جاتے ہیں۔

عام جواب تو یہ ہے کہ تقدیر، لیکن یہ جواب صرف اسی سوال کا نہیں بلکہ دنیا کے تمام سوالوں کا جواب ہے اور ہم کو ایسے جواب کی ضرورت ہے جس کو اس سوال سے بھی کوئی خاص خصوصیت ہو، بعضوں کا خیال ہے کہ انقلابِ سلطنت لیکن اسلامی سلطنتوں کی نسبت کیا کہا جائے گا، خاص قسطنطنیہ میں کم سے کم بیس ہزار طلبا علوم عربیہ کی تعلیم پاتے ہیں لیکن مدتوں سے ایک شخص بھی صاحب کمال نہیں پیدا ہوا اور سچ یہ ہے کہ مصر و شام و روم کا علمی معیار ہندوستان سے بھی گھٹا ہوا ہے، اس سوال کا صحیح جواب صرف یہ ہے کہ "نصابِ تعلیم کا نقص" اس کی تفصیل آگے آئے گی لیکن تفصیل سے پہلے بعض ظاہر الورود اعتراضات کا ذکر کرنا اور ان کا جواب دینا ضرور ہے۔

اس جواب پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسی نصاب نے عبد العلی بحر العلوم، حمد اللہ، محب اللہ بہاری، قاضی مبارک، شاہ ولی اللہ، ملا حسن جیسے اشخاص

پیدا کیے تھے، اس لیے اگر نصابِ تعلیم کا قصور ہوتا تو اس سے اس درجہ کے کامل الفن کیوں کر پیدا ہوتے۔

اس اعتراض کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ جو نصاب اب ہے وہ ان بزرگوں کے زمانہ میں کہاں تھا، شرح سلم، حمد اللہ، شرح سلم ملاحسن، حاشیہ بحر العلوم، قاضی غلام یحییٰ، ہدیہ سعیدیہ وغیرہ یہ کتابیں اس زمانہ میں کہاں تھیں لیکن اس اعتراض کا حقیقی جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی خرابی کا اثر عموماً ابتدا میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر پہلے پیدا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر علانیہ ظاہر ہو جاتا ہے، موجودہ نصاب کی خرابی کا اثر پہلے ہی دن شروع ہو گیا تھا، جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا عین اسی وقت سے علم کا تنزل شروع ہو گیا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے یعنی جس درجہ کے علما اس وقت تھے، ان کے شاگردان سے کم درجہ کے نکلے، شاگرد کے شاگردان سے بھی کم پھر ان سے بھی کم، یہاں تک کہ یہ زمانہ آ گیا جس میں کمال کا نام و نشان بھی نہ رہا۔

پہلے طبقوں کا تنزل ہم کو اس لیے محسوس نہیں ہوتا کہ گو وہ لوگ علم و فضل میں اگلوں سے کم تھے، تاہم آج کی حالت کے لحاظ سے نہایت بلند رتبہ تھے، لیکن جب تنزل کی رفتار روز بروز تیز ہوتی گئی اور اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک بھی صاحبِ فن نظر نہیں آتا تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ یہ نتیجہ اسی تخم کا ثمر ہے جو سو برس پہلے بویا گیا تھا، ہم اس دعویٰ کے ثابت کرنے کے لیے امارات و قراین پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ قطعی طریقہ سے ثابت کرتے ہیں کہ موجودہ نصابِ تعلیم نہایت ناقص اور ابتر ہے، سب سے پہلے ہم کو چند مقدمات اصول موضوعہ کے طور پر ذہن نشین کر لینے چاہئیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے۔

۲۔ ہر فن کے حاصل کرنے کا یہ عمدہ طریقہ ہے کہ اس کے مسائل کو منفرداً اور

بہ استقلال حاصل کیا جائے تا کہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے، بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائے گا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہوگی۔

۳۔ متعدد علوم وفنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضرور ہے یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے، جو مقصود بالعرض ہیں ان میں کم، اسی طرح علوم مقصود بالذات بھی بلحاظ اہمیت کے فرقِ مراتب کرنا چاہیے یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں۔

۴۔ ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو۔

مذکورہ بالا اصول کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، اب ان اصول کی بنا پر ہم موجودہ نصاب سے بحث کرتے ہیں۔

۱۔ موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جن میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن کا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے یعنی اگر اصل مسئلہ کو دوسرے الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جائیں مثلاً شمسیہ میں یہ عبارت تھی کہ **العلم اما تصور فقط وھو الخ** قطبی میں اس کے متعلق ایک بڑی بحث اس بنا پر چھیڑ دی گئی کہ ھو کی ضمیر **تصور** کی طرف پھرتی ہے یا **تصور فقط** کی طرف، اس بحث میں قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہو گئے، لیکن اگر مصنف ضمیر کے بجائے خود مرجع کو ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثیں رائگاں جاتیں، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے، مصنف کے ایک خاص لفظ اور اس کے منشا پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

نصابِ موجودہ کی اکثر کتابوں کی یہی حالت ہے یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہیں ان کے قریب بلکہ ان سے زیادہ یہ فضول لفظی مسائل ہیں۔

اس موقع پر یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قدما کے زمانہ میں شرح اور

حاشیہ کا طریقہ نہ تھا، بوعلی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا، لیکن اس وقت تک شرح میں بھی مصنف کی خاص عبارت اور الفاظ سے بحث نہیں کرتے تھے بلکہ اصل مسئلہ کی توضیح اور تشریح کرتے تھے، اسکے بعد یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چنداں غرض نہیں رہی بلکہ تمامتر توجہ اس پر صرف ہوتی تھی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے؟ کس لفظ سے کیا خاص فائدہ ہے؟ کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے؟ مصنف کی عبارت کا اوروں نے جو مطلب سمجھا ہے غلط ہے، فلاں جگہ مصنف نے دفع دخل مقدر کیا ہے، مصنف کی عبارت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ جس وقت سے یہ طریقہ جاری ہوا وہ علمی تنزل کا پہلا دن تھا۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ میں ایک مضمون لکھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "فی أن کثرة التالیف فی العلوم عایقة عن التحصیل" اس مضمون کا ماحصل یہی ہے، چنانچہ وہ مثلاً فن فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لکھ کر لکھتے ہیں:

وھی کلھا متکررة والمعنی واحد والمتعلم مطالب باستحضار جمیعھا وتمیز ما بینھا والعمر ینقضی فی واحد منھا ولو اقتصر المعلمون بالمتعلمین علی المسائل المذھبیة فقط لکان الأمر بدون ذلک بکثیر وکان التعلیم سھلاً	یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں اور مطلب ایک ہے اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے اور عمر ایک ہی کے محفوظ رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے، اس لیے اگر مدرسین صرف مسائل مذہبی پر اکتفا کرتے تو تعلیم نہایت سہل ہوتی اور بہت کم زمانہ صرف ہوتا۔

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے زمانہ میں بھی وہی حالت تھی جواب ہے، یعنی باوجود اس طریقے کی خرابی کے لوگ اس کو ترک نہیں کر سکتے تھے، کیوں کہ یہ طریقہ لوگوں کے لیے بجائے طبیعت ثانیہ کے ہو گیا تھا، چنانچہ علامۂ موصوف عبارت مذکورہ کے بعد لکھتے ہیں:

ولکنه داء لایرتفع لاستقرار العواید علیه فصارت کالطبیعة	لیکن یہ ایک مرض بن گیا ہے جو دفع نہیں ہوسکتا کیوں کہ معمول عام ہوجانے کی وجہ سے وہ بجائے طبیعت کے ہوگیا ہے

۲-سب سے بڑی خرابی نصاب موجودہ کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں داخل ہیں جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم کا ذہن پریشان ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے، ملاحسن، حمداللہ، قاضی مبارک منطق کی کتابیں ہیں لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور مابعدالطبیعہ کے ہیں مثلاً علم باری، جعل بسیط وجعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج، وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ

ملا جلال فن منطق میں بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے لیکن جس قدر درس میں ہے، اس کا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح میں ہے جو صرف اس خاص عبارت سے متعلق ہے جو مصنف نے حمد ونعت میں لکھی ہے، ان کتابوں کے درس کا جو زمانہ رکھا گیا ہے اس وقت تک میبذی کے سوا فلسفہ کی اور کوئی کتاب پڑھائی نہیں جاتی، اس لیے الٰہیات کے مباحث طالب العلم کو بالکل اجنبی اور سخت نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔

۳-بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہیں، ان کو مقصود بالذات بنالیا گیا ہے اور زمانۂ تحصیل کا بڑا حصہ انھیں کے حاصل کرنے میں صرف کردیا جاتا ہے مثلاً نحو، صرف، منطق مقصود بالعرض ہیں لیکن کتب درسیہ زیادہ تر انہی فنون کے متعلق ہیں، منطق کا مقصود یہ ہے کہ فلسفہ میں کام آئے لیکن منطق کی درسی کتابیں فلسفہ کے اعتبار سے اضعافاً مضاعفہ ہیں، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، تہذیب شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملاحسن، ملا جلال، میر زاہد، حمداللہ، قاضی مبارک یہ انبار کا انبار منطق میں ہے اور درس میں داخل ہے، لیکن فلسفہ کی صرف تین کتابیں درس میں داخل ہیں جن میں سے میبذی پوری پڑھائی جاتی ہے، باقی کے جستہ جستہ مقامات۔

اسی طرح نحو و صرف میں برسوں اوقات صرف کی جاتی ہے اور جو اس کی غرض و غایت ہے یعنی علم ادب اس میں بہت کم زمانہ صرف ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں طلبا میں سے ایک بھی صاحب فن نہیں پیدا ہوتا۔

علامہ ابن خلدون نے اس خرابی پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

وأما العلوم التی هی آلة لغیرها مثل العربیة والمنطق وأمثالها فلاینبغی ان ینظر فیها الا من حیث هی آلة لذلک الغیر فقط ولایوسع فیها الکلام ولاتفرع المسائل لأن ذلک مخرج لها عن المقصود	باقی وہ علوم جو دوسرے علموں کا آلہ ہیں مثلاً عربیت اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ وہ فلاں علم کا آلہ ہیں، ان میں نہ کلام کو وسعت دینی چاہیے نہ مسائل کی تفریع کرنی چاہیے کیونکہ ایسا کرنا اس کو اصل مقصد سے خارج کر دینا ہے۔
فیکون الاشتغال بهذه العلوم الآلیة تضیعاً للعمر وشغلاً بما لا یعنی وهذا کما فعل المتاخرون فی صناعة النحو وصناعة المنطق واصول الفقه لأنهم أوسعوا دائرة الکلام فیها	تو ان علوم آلیہ میں مشغول ہونا عمر کا ضایع کرنا ہے اور لایعنی کام میں مشغول ہونا ہے جیسا کہ متاخرین نے نحو اور منطق اور اصول فقہ کے متعلق کیا یعنی کلام کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا۔
فهی من نوع اللغو وهی أیضاً مضرة بالمتعلمین علی الاطلاق	یہ تو ایک قسم کی لغویت ہے اور وہ طالب العلموں کو بھی عموماً مضر ہے۔
فاذا قطعوا العمر فی تحصیل الوسائل فمتی یظفرون بالمقاصد	کیونکہ جب وہ وسائل میں عمر ضایع کر دیں گے تو اصل مقصد تک کب پہنچیں گے۔

(الندوہ ج ۱ نمبر ۲ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ)

فن نحو کی مروجہ کتابیں

ابن حاجب نے کافیہ میں مسائل نحویہ کو جس طریقہ سے مدون کیا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بعد جس قدر کتابیں اس فن میں لکھی گئیں گویا اسی کی عکسی تصویریں تھیں، ایک مدت کی ممارست اور انس کی وجہ سے اب یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس طریقہ میں کوئی نقص ہوگا، لیکن آؤ تقلید کے دائرہ سے نکل کر دیکھیں کہ کیا ایسا ہی ہے۔

علوم وفنون کی تدوین میں عمدگی کا جو معیار قرار دیا جاسکتا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

۱- مسائل کی ترتیب اصولی عقلی کے بنا پر ہو۔

۲- جو اصطلاحات قایم کیے جائیں ان کے لغوی اور مصطلح معنی میں نمایاں تناسب ہو تاکہ لغوی معنی سے اصطلاحی معنی کی طرف خیال جلد منتقل ہو سکے۔

۳- قواعد کلیہ کی تعداد اس قدر کم ہو کہ اس سے کم نہ ہو سکتی ہو۔

سب سے پہلے ہم اس پر بحث کرتے ہیں کہ موجودہ ترتیب کہاں تک اصول عقلی پر مبنی ہے، اس کے لیے پہلے ہم کو نحو کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا چاہیے۔

نحو کی تعریف متاخرین نے یہ کی ہے **علم باصول یعرف بها أحوال أواخر الكلم** لیکن اگر نحو کی یہی حقیقت ہے تو جن زبانوں میں اعراب نہیں ہے، ان کے لیے نحو کا فن بالکل بے کار ہوگا، کیوں کہ اس تعریف کی رو سے نحو کا یہ مقصد ہے کہ الفاظ کا اعراب معلوم کیا جائے، اس لیے جن زبانوں میں سرے سے اعراب نہیں

مثلاً موجودہ فارسی یا اہل زبان کی عربی جس میں تمام الفاظ ساکن الاواخر ہوتے ہیں اور عوامل کے آنے سے ان میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا، وہ نحو کے دائرہ سے باہر ہوں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان میں ادائے مطلب کے لیے الفاظ کی ترتیب کا خاص طریقہ ہے، یہ طریقے بعض مشترک ہوتے ہیں بعض اور کسی دوسری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں اور بعض غیر مشترک جو خاص ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں، انھیں طریقوں کے جزئیات کا نام نحو ہے اور نحو کی تدوین کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام جزئیات کا استقصا کر کے ان کو کلیات کے تحت میں لایا جائے۔

علامہ ابن خلدون نے نحو کی تعریف ان جامع الفاظ میں کی ہے: **بـه تبيين أصـول الـمقاصد بالدلالة** اس تعریف سے ثابت ہوگا کہ نحو کا اصلی مقصد ادائے معانی سے متعلق ہے، یعنی جب ہم ایک مطلب ادا کرنا چاہیں تو ہم کو فاعل، مفعول، متعلقات فعل وغیرہ کو کس ترتیب سے لانا چاہیے، باقی یہ امر کہ الفاظ پر ان تراکیب کا کیا اثر پڑتا ہے اور اواخرِ حروف کو کس حالت میں کون سا اعراب ہوتا ہے، یہ ایک ضمنی مسئلہ ہے، البتہ چونکہ نحو کی تدوین اصل میں علمائے عجم نے کی اور ان کے لیے اعراب کی صحت بھی ایک امر اہم تھی، اس لیے رفتہ رفتہ اعراب کی حیثیت اس قدر اہم ہوگئی کہ متاخرین نے اس کو عین نحو سمجھ لیا۔

جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ نحو کا اصلی تعلق الفاظ کی ترتیب اور تقدیم و تاخیر سے ہے تو نحو کی ترتیب یہ ہونی چاہیے کہ کلام کے جو اجزا سب سے مقدم ہیں، ان کا حال پہلے بیان کیا جائے پھر ان سے کم درجہ کے اجزا کا حال پھر ان سے کم کا، اس لحاظ سے پہلے مسند الیہ کا حال بیان کرنا چاہیے، پھر مسند کا پھر متعلقات کا، پھر توابع کا، اس بنا پر مبتدا، فاعل، حروف مشبہ کے اسماء، افعال ناقصہ کی خبر و امثال ہذہ کا حال ایک عنوان کے نیچے لکھنا چاہیے، لیکن متاخرین نے اس معنوی حیثیت کو چھوڑ کر صرف

اعراب کا لحاظ رکھا اور مرفوعات، منصوبات اور مجرورات کے لحاظ سے ترتیب قایم کی، اس اعراب پرستی کی وجہ سے بہت سے مسائل کی حیثیت بدل گئی اور ان کے موقع ترتیب میں فرق آ گیا، چنانچہ ہم چند مثالیں ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱- مفعول لہ معنی کے لحاظ سے مجرور باللام ہے، **ضربته تادیباً** اور **ضربته للتادیب** میں معناً کسی طرح کا فرق نہیں لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کو فتحہ ہوتا ہے، اس کے لیے زبردستی ایک نیا نام ایجاد کیا گیا اور اس کو مفعول کے اقسام میں شمار کیا گیا۔

یہی کیفیت مفعول معہ کی ہے، خوب غور سے دیکھو معنی کے اعتبار سے مفعول معہ اور معطوف بالکل ایک ہیں، صرف اعراب کی بنا پر اس کو مفعول کا لقب دیا گیا، حالانکہ یہ نہایت آسان بات تھی کہ اس کو واؤ عاطفہ کے تحت میں بیان کیا جاتا اور اس قدر اضافہ کر دیا جاتا کہ بعض موقعوں پر معطوف کو فتحہ ہوتا ہے، اس کے ساتھ مفعول معہ کے خصوصیات بیان کر دی جاتیں۔

۲- حروف مشبہ کے اسما مسند الیہ ہیں اور اس لحاظ سے ان کو فاعل اور مبتدا کے ساتھ بیان کرنا چاہیے، لیکن اعراب کے لحاظ سے وہ منصوبات میں داخل کیے گئے، اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

ایک بڑا نقص موجودہ نحو میں یہ ہے کہ کلمات کے بہت سے اقسام اور اصطلاحات بے فائدہ بنائے گئے ہیں، چنانچہ ہم چند مثالیں درج ذیل کرتے ہیں۔

۱- مفعول مالم یسم فاعلہ کو ایک خاص اصطلاح قرار دینا اور اس کے مسائل جداگانہ لکھنا بے کار ہے، مفعول مالم یسم فاعلہ کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ فعل مجہول کے فاعل کا نام ہے، فاعل کے لیے یہ ضرور نہیں کہ اس سے فعل کا ارتکاب ہوا ہو، بلکہ اصطلاحِ نحو میں فاعل کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ وہ فعل یا شبہ فعل کا مسند الیہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ **ضُرِبَ زَیْدٌ** میں مضروبیت کی اسناد زید کی طرف ہے، اس بنا پر وہ

بھی اسی طرح فاعل ہے، جس طرح 'ضَرِبَ زَیْدٌ' میں زید۔

۲-افعال ناقصہ کو تمام افعال سے جداگانہ قرار دینا اور اس کے معمول کے لیے بالکل ایک نئی اصطلاح اسم وخبر کے نام سے قایم کرنا محض لغو ہے، یہ غلطی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ افعال ناقصہ کو فعل لازم سمجھا ہے، حالانکہ وہ درحقیقت متعدی ہیں، چنانچہ اس کا بیان آگے آئے گا۔

۳-افعال مقاربت کی جداگانہ اصطلاح قایم کرنا بے فائدہ ہے، افعالِ مقاربت میں جس چیز کو اسم کہتے ہیں وہ درحقیقت فاعل ہے اور جس کو خبر کہتے ہیں، وہ مفعول ہے، ان افعال میں بھی فعل تنہا فاعل پر تمام نہیں ہوتا بلکہ ایک اور چیز کا محتاج رہتا ہے اور وہی مفعول ہے۔

۴-اسی طرح افعال مدح وذم کی اصطلاح کی بھی ضرورت نہیں **نعم الرجل زید** میں الرجل فاعل ہے اور زید بدل اور یہ معمولی ترکیب ہے۔

متعدی کی تعریف کافیہ وغیرہ میں یہ کی ہے ما یتوقف فھمہ علی متعلق اس بنا پر افعال ناقصہ عموماً متعدی ہیں کیوں کہ ان کا مفہوم تنہا فاعل سے سمجھ میں نہیں آتا، علامہ رضی نے تصریح کی ہے کہ اس تعریف کی بنا پر قرب وغیرہ متعدی ہیں، چنانچہ لازم و متعدی کی بحث میں لکھتے ہیں: **وعلی ما حد ینبغی ان یکون نحو قرب وبعد وخرج ودخل متعدیا اذا لا یفھم معانیھا الا بمتعلق** اس بنا پر افعال ناقصہ کے اسم وخبر درحقیقت فاعل ومفعول ہیں۔

(الندوہ ج ا نمبر ۶ شوال ۱۳۲۲ھ)

تعلیم قدیم وجدید

کیاان میں سے کوئی غیرضروری ہے؟ کیاان دونوں میں تعارض ہے؟ کیا
ان میں کسی اصلاح کی ضرورت ہے؟ دونوں مل کر کیوں کر کام کر سکتے ہیں؟

اگر چہ یہ سوالات قومی مسئلہ کے متعلق اہم اور ضروری سوالات ہیں، لیکن قوم نے کبھی ان سوالات پر مستقل حیثیت سے بحث نہیں کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دنیوی اور دینی درسگاہیں یا انجمنیں ملک میں قایم ہیں ان کو جو کامیابی اس وقت حاصل ہے، وہ اس پر قانع تھیں، اس لیے ان مسائل کے حل کرنے کی ان کو ضرورت معلوم نہیں ہوئی، مثلاً اسلامی کالجوں میں سیکڑوں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں، ہرسال سیکڑوں ایم اے اور بی اے ہوکر نکلتے ہیں، سیکڑوں فارغ شدہ طلبہ نے معقول نوکریاں حاصل کیں، سیکڑوں وکالت کررہے ہیں، سیکڑوں اپرنٹس اور امیدوار ہیں، ان باتوں کے ہوتے ان کو اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ قدیم تعلیم کی ضرورت اوراس کے نتائج اور ترمیم واصلاح کا سودا مول لیں۔

کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد
ہرچہ گیرید مختصر گیرید

اس کے مقابلہ میں عربی مدارس دیکھ رہے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ مساجد میں پھیلے ہوئے ہیں، ہزاروں مولوی تیار ہوگئے ہیں، ہرہر ضلع میں عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قایم ہوتے جاتے ہیں، ہرجگہ واعظوں کی مانگ ہے، ان باتوں کے ساتھ ان کو کیا غرض ہے کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت اور نتائج پر غور کرنے

کی زحمت اٹھائیں۔

لیکن اب اس سکون میں کچھ جنبش پیدا ہو چلی ہے، کیوں کہ اب ہر گروہ جس قسم کی تعلیم کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک میں وہی تعلیم پھیل جائے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں گروہوں میں تقابل، مسابقت اور محاسدہ پیدا ہو، چنانچہ ایسا ہوا، صرف یہ امتیاز باقی رہا کہ پست حوصلہ لوگوں نے علانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنوں کی برائی شروع کی اور مہذب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا۔

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ کرور مسلمانوں سے دونوں کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لیے مدد مل سکتی ہے، لیکن واقعی اب اس کا وقت آ گیا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک وسیع خاکہ تیار کر دے، جس میں تمام درس گاہوں اور انجمنوں کی نسبت طے کر دیا جائے کہ کون کون ضروری ہیں، کس حد تک ضروری ہیں؟ اور مجوزہ نقشہ میں ہر ایک کی جگہ کہاں ہے؟ تا کہ جو کام ہو رہے ہیں سب مل کر ایک کام بن جائیں اور ایک کام دوسرے کام میں خلل انداز نہ ہونے پائے، ورنہ دوطرفہ کشمکش میں ہزاروں لاکھوں مسلمان یہ فیصلہ نہ کر سکیں گے کہ وہ کس رخ اور کدھر جائیں۔

اس غرض سے سوالاتِ ذیل پر نظر ڈالنی چاہیے۔

جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟

دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

علی گڈھ، دیوبند، ندوہ کے کیا حدود ہیں اور کون کون کام کس کس کے حدِ عمل میں چھوڑ دینے چاہئیں۔

پہلے سوال کے جواب میں اب اختلاف نہیں رہا اور اگر کسی کو ہو تو ہم کو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعۃً نفی کی صورت میں آئے گا، لیکن ان کو ذرا غور سے کام لینا چاہیے اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہیے۔

کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قایم رہے گی؟

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم، قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہوسکتی ہے، کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخِ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہیں ان کے مقابلہ کے لیے اتنی تعلیم کافی ہے؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر قایم ہوسکتا ہے؟

تیسرا سوال یعنی یہ کہ دونوں طریقۂ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں، ایک معرکہ کا سوال ہے، نہ اس لیے کہ درحقیقت وہ ایسا ہے بلکہ اس لیے کہ دونوں فریق ایک مدت سے اسی حالت پر قایم ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کامیاب ہیں، اس لیے ان کو علانیہ نظر آتا ہے کہ اصلاح کی ضرورت نہیں، تاہم جدید گروہ بہ آسانی اپنے خلاف نکتہ چینی سے سننے پر آمادہ ہوسکتا ہے، اس لیے پہلے ہم انھیں سے خطاب کرتے ہیں۔

اس قدر مسلم ہونے کے بعد کہ تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے، یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس ضرورت کی مقدار کیا ہے؟ اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ، افتا کا کام لینا نہیں ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بہ قدرِ ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں، اس کے لیے صرف ایک مختصر اور جامع و مانع سلسلۂ دینیات کی ضرورت ہے، جس میں سلسلہ بہ سلسلہ اسکول سے کالج کلاسوں تک کے قابل کتابیں ہوں، اس سلسلہ میں تین قسم کی کتابیں ہونی چاہئیں۔ فقہ، عقائد، تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ کے متعلق مصر میں عمدہ کتابیں تیار ہوگئی ہیں، ان کا ترجمہ کافی ہوگا، عقائد کی نسبت البتہ مشکل ہے کیونکہ ہندوستان میں جو کتابیں آج کل لکھی گئی ہیں ان پر ابھی تمام لوگوں کا اتفاق نہیں ہوسکتا اور مصر وغیرہ کی جدید تصنیفات ناکافی اور ناقابل درس ہیں، اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کلاسوں میں صرف فقہ اور تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو اور کالج کلاسوں میں امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی ہی زبان میں پڑھائی جائیں اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحوں سے زیادہ نہ ہو۔

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہوسکتا بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے، دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے، مذہبی علما بیش قرار مشاہرہ کے مقرر کیے جائیں، وعظ کے موقعوں پر اکثر ارکانِ کالج تا امکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بنا پر طلبہ کی خاص توقیر اور تحسین کی جائے اور سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبہ کو گراں بہا وظایف دے کر ڈگری حاصل کرنے کے بعد مذہبی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی جائے۔

یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم میں سخت اصلاح اور اضافہ کی ضرورت ہے، لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علما اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں، اس لیے ہم ان سے سوالاتِ ذیل کے جواب چاہتے ہیں۔

۱- یورپ کے مصنفین مذہب پر جو حملہ کر رہے ہیں، اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۲- اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شایع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟

۳- مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟

۴- علما جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے، جواب کیوں کر دے سکیں گے؟

۵- کیا علماے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دئے تھے؟

۶- اگر اس وقت اس زمانے کے فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں ہے؟

ان سوالات کا اگر چہ خود بخود یہ جواب ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے، لیکن بایں ہمہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ان علما کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں خیال کرتے اصلاح پر مجبور کریں، اس کی وجہ ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکامِ اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے، جس کے لیے سیکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے، اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں، اس لیے تقسیم عمل کے رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دے دینے چاہئیں اور ہر طرح پر ان کی تائید و

اعانت اور احترام کرنا چاہیے، اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بیکار بتاتے ہیں، وہ بھی تسلیم کرلیں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بے کار نہیں ہے، صرف ہم کو ان کا استعمال صحیح طور سے کرنا چاہیے، صحابہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے جو لاکھوں روپئے کے مالک تھے اور حضرت ابوذرؓ بھی تھے جن کا قول تھا کہ صاحب المال کافر (جس کے پاس روپیہ ہو وہ کافر ہے) بایں ہمہ اسلام کو دونوں کی ذات سے نفع پہنچتا تھا، کیوں کہ دونوں سے مختلف کام لیے جاتے تھے، البتہ اس قسم کے قدیم مدرسوں میں اس قسم کی تربیت پر اصرار کرنا چاہیے جس سے تعصب، سخت دلی، تنگ خیالی نہ پیدا ہو جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پرانے مولوی اور جدید تعلیم یافتہ ایک صحبت میں بسر نہیں کر سکتے اور ہر موقع پر دونوں دو حریف کی صورت میں نظر آتے ہیں، ان لوگوں کو دربار نبوی کا نمونہ پیش نظر رکھنا چاہیے جہاں کافروں اور منافقوں تک کو بار ملتا تھا اور ان کی بھی خاطر داری کی جاتی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تو ان کو حکم ہوا کہ قولا له قولا لینا یعنی فرعون سے نرمی سے بات کرنا؟

دونوں گروہ اب قوم کے ضروری اجزا ہیں، اس لیے دونوں کو آپس میں دست و بازو ہو کر کام کرنا چاہیے۔

لیکن علما کے جس گروہ نے جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا ہے اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح و اضافہ کرنا چاہتے ہیں، وہ ان اصول کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں جو ندوہ نے اختیار کیا ہے اور جو عملی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

اگر قوم ان واقعات کو پیش نظر رکھے تو آج کل قوم کی کوششوں کی پراگندگی کا جو اعتراض ہے وہ اٹھ جائے اور لوگ اطمینان اور سکون اور بے تعصبی کے ساتھ اپنی اپنی حدود میں محدود رہ کر اپنے کاموں کو انجام دیں۔ (الندوہ ج ۷ نمبر ۹ ستمبر ۱۹۱۰ء)

ہوا کا رخ دوسری طرف

مشرقی کانفرس

ندوۃ العلما کے متعلق ایک فرقہ تو وہ ہے جس کی منفصلہ راے یہ ہے کہ یہ ایک بے معنی بلکہ مضر کام ہے لیکن جو لوگ اس کو اصولاً مفید بھی سمجھتے تھے وہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ ہوا کا رخ دوسری طرف ہے، اس لیے ندوہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔

میرا اصولِ عمل یہ ہے کہ اگر ایک کام قوم اور مذہب کے لیے ضروری ہے تو ہمارا فرض اس کے لیے کوشش کرنا ہے، کامیابی یا ناکامیابی سے ہم کو بحث نہیں، ہم ان لوگوں میں ہیں جن کا قومی نعرہ یہ تھا۔

اذاھم القی بین عینیہ عزمہ ونکب عن ذکر العواقب جانبا

جب قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو آنکھوں کے سامنے رکھ لیتا ہے۔ اور اس سے کچھ بحث نہیں کرتا کہ انجام کیا ہوگا؟

سمندر میں جب کوئی کشتی شکستہ ڈوبنے لگتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ کوسوں تک کنارہ کا پتہ نہیں، کوئی سہارا نہیں، اس کی شناوری سمندر کے عرض وطول کا مقابلہ نہیں کرسکتی، تاہم کیا وہ دیدہ و دانستہ ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دیا ہے اور قصداً ڈوب جاتا ہے؟

ہمارا اسی قدر فرض ہے، فرض کا ادا کرنا ہی کامیابی ہے، کسی اور کامیابی کی ہم کو ضرورت نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہاتفِ غیب کی دھیمی اور آہستہ

آواز بھی میرے کانوں میں آیا کرتی تھی کہ ممکن ہے کہ خود ہوا کا رخ بدل جائے، مشرقی کانفرنس اسی خواب کی تعبیر ہے۔

مشرقی تعلیم کی تحریکیں اس سے پہلے بھی ہوئیں، ڈاکٹر لائیز کی سرگرم کوششوں سے پنجاب میں تعلیم مشرقی کی ایک شاخ یونی ورسٹی میں قایم ہوئی، الہ آباد یونی ورسٹی میں ملا اور فاضل کے امتحانات اسی خیال کے ناتمام خاکے ہیں، سرسید مرحوم نے ہمیشہ ان کوششوں کی سخت مخالفت کی، پنجاب یونی ورسٹی پر ان کے تین پرزور آرٹیکل، قلعہ شکن توپیں تھیں جن کے صدمہ نے مشرقی تعلیم کو چکنا چور کر دیا، الہ آباد یونی ورسٹی جب بن رہی تھی اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائے گی تو سرسید نے متعدد آرٹیکل اس زور کے لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اڑ گئے؛ سرسید کی مخالفت اس پر مبنی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم کی یہ کوشش مغربی تعلیم کو روک دے گی جو ملک کے لیے نہایت ضرر رساں کام ہے۔

اس میں ایک ذرہ شبہ نہیں کہ اگر ہم کو یہ یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی تجویز سے مغربی تعلیم میں ذرہ بھر بھی کمی ہوگی تو ہمارا فرض ہے کہ اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار کر دیں۔

مسلمان اس وقت 'کشمکش زندگی' کے میدان میں ہیں، ان کی ہمسایہ قومیں مغربی تعلیم ہی کی بدولت ان سے اس میدان میں بڑھ رہی ہیں، اگر خدانخواستہ مسلمان مغربی تعلیم کی کوشش میں ذرا بھی پیچھے رہ جائیں تو ان کی ملکی اور قومی زندگی دفعۃً برباد ہو جائے گی۔

لیکن اب وہ حالت نہیں ہے، مسلمانوں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ ان کی دنیوی ترقی صرف اس بات پر موقوف ہے کہ ان کا ایک ایک بچہ انگریزی میں تعلیم یافتہ ہو جائے، لیکن باوجود اس کے یہ ممکن ہے کہ مشرقی تعلیم کے لیے بھی جگہ نکل سکے، ترقی یافتہ قوموں کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، یورپ سب کچھ کر رہا ہے تاہم ان میں

ایک وسیع گروہ موجود ہے جو اپنی مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کا محافظ ہے، خود ہماری ہمسایہ قوموں کا کیا حال ہے، آریہ انگریزی تعلیم میں اس تیزی سے ترقی کررہے ہیں کہ مسلمان ان کی گرد تک بھی نہیں پہنچتے، تاہم وہ گروکل بھی قایم کررہے ہیں جو سنسکرت کی تعلیم کے لیے مخصوص ہے اور جس کا مقصد صرف اپنے مذہب اور اپنے لٹریچر کی اشاعت ہے، اس گروکل میں جو لڑکے داخل ہوتے ہیں ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام نہیں کریں گے، ۲۴ برس کی عمر تک ان کو تعلیم دی جاتی ہے، ان کو نہایت سادی اور خشک غذا دی جاتی ہے، سونے کو لکڑی کا تختہ ملتا ہے، اپنے ہاتھ سے سب کام کرنا پڑتا ہے، اس جفاکشی اور دنیاوی بےتعلقی کے ساتھ تین سو دولت مندوں نے اپنے بچے اس میں بھیج دئے ہیں اور ۲۴ ماہوار ایک ایک بچہ کا خرچ دیتے ہیں، ہر سال اس مدرسہ کے لیے لاکھوں کا چندہ جمع ہو جاتا ہے اور اس کی شاخیں جابجا قایم ہوتی جاتی ہیں۔

کیا اس مدرسہ نے آریوں میں انگریزی تعلیم کو کم کردیا ہے؟ کیا انگریزی تعلیم پر کوئی برا اثر ڈالا ہے؟ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کے تعلیم یافتہ مدرسہ سے نکل کر تمام قوم میں انگریزی تعلیم اور دنیاوی ترقی کی روح پھونک دیں گے، تیرانداز اپنی جگہ پر رہتا ہے، لیکن تیر کوسوں نکل جاتا ہے، رجز خواں خود نہیں لڑتے لیکن ہزاروں لڑنے والے پیدا کردیتے ہیں۔

غرض اگر یورپ کو بہ ایں دنیا طلبی پادریوں کی حاجت ہے، اگر آریوں کو بہ ایں انگریزی خوانی گروکل کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کو بھی عربی تعلیم اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمانوں کی قوم کا باقی رہنا ضرور ہے۔

انھیں اسباب سے باوجود تمام مخالفتوں کے ندوہ قایم ہوا اور باوجود تمام مزاحمتوں کے اس نے اپنا وجود قایم رکھا، یہ سوال پہلے ہی دن پیدا ہوا کہ ندوہ کے تعلیم

یافتہ کیا کھائیں گے؟اس کا جواب آسان تو یہ تھا کہ اب تک عام مولوی کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور علم الاعداد سے نظر آتا ہے کہ عربی مدرسوں کی تعداد گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی جاتی ہے، جب ہم اس کو روک نہیں سکتے تو اس میں کیا ہرج ہے کہ اس گروہ کو زیادہ بکار آمد بنادیا جائے۔

لیکن اس کا اصلی اور صحیح جواب یہ ہے کہ مسلمان بہت جلد اس بات کا احساس کریں گے کہ ان کو اپنی قومیت اور مذہب کے بقا کے لیے مشنری (یعنی مبلغینِ اسلام) قایم کرنے کی ضرورت ہے، یورپ اس قدر دنیوی تعلیم میں منہمک ہے، تاہم صرف لندن میں مشنری پر دوکروڑ روپیہ سالانہ خرچ کر رہا ہے، جب اسلامی مشنری قایم ہوگی تو اس کے موزوں اور صحیح کارکن صرف ندوہ مہیا کر سکے گا۔

لیکن چونکہ ابھی تک اسلامی مشنری کا باقاعدہ طریقہ نہیں قایم ہوا اس لیے اس سوال کے جواب دینے کے لیے اور پہلوؤں پر بھی نظر پڑتی تھی، انھیں میں ایک یہ بھی تھا کہ ندوہ کے تعلیم یافتہ کیا گورنمنٹ کے بھی کچھ کام آسکتے ہیں۔

گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی اب تک یہ تھی کہ وہ مذہبی تعلیم سے بالکل الگ تھی اور مشرقی تعلیم بھی اس میں محض برائے نام تھی، لیکن ملک کی عام رائے یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کے بغیر اخلاق اور تربیت کا شیرازہ قایم نہیں رہ سکتا، اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ عربی اور سنسکرت زبانوں کی اعلیٰ تعلیم بھی سلسلۂ تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ گورنمنٹ نے بھی مذہبی تعلیم کی ضرورت کا احساس کیا یا نہیں، لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ گورنمنٹ نے اس بات کو ضروری خیال کیا کہ مشرقی تعلیم کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے، حال میں گورنمنٹ نے جو مشرقی کانفرنس شملہ میں قایم کی، اس کے مقاصد میں سے بعض مقاصد یہ تھے۔

(۱) مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا۔

(۲) علم الآثار (ارکیالوجی) کی تعلیم دینا اور جدید طریقۂ تحقیقات آثار قدیمہ

سے واقف کرنا۔

(۳) اعلیٰ طریقہ پر قدیم وقلمی کتب خانوں کی فہرست سازی (کیٹلوگنگ) کی تعلیم دینا۔

(۴) اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لیے بیش قرار وظایف مقرر کرنا۔

(۵) دینی زبانوں کو ترقی دینا اور ان کے لیے امتحانات قایم کرنا۔

(۶) علمی مشرقی تعلیم یافتوں کے لیے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقات آثار قدیمہ اور قدیم کتب خانوں میں ترتیب فہرست کے لیے عہدے قایم کرنا۔

(۷) کلکتہ کی مشرقی درس گاہوں کو متفق ومتحد کرنا۔

(۸) افسروں کی زباندانی کا امتحان لینا۔

(۹) کلکتہ میں اغراض بالا کے لیے ایک عظیم الشان مشرقی درسگاہ قایم کرنا۔

یہ ظاہر بات ہے کہ علما کا گروہ مسلمانوں کی جماعت کا ایک ضروری جز ہے ان کی تعداد کثیر ملک میں موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی، ان کا قوم پر نہایت قوی اثر ہے، عربی زبان ایک علمی زبان ہے، ان اسباب سے یہ مناسب نہیں کہ مشرقی تعلیم سے بالکل بے اعتنائی اختیار کی جائے، البتہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کو زیادہ بکار آمد بنایا جائے اور مذہبی حصہ کو چھوڑ کر باقی چیزوں میں ایسی ترقی اور اصلاح کی جائے کہ مشرقی تعلیم یافتہ لوگوں کی معاش کے لیے کچھ وسائل پیدا ہو سکیں۔

کانفرنس نے جو کچھ طے کیا ہے، ابھی اس کی باضابطہ منظوری نہیں ہوئی ہے، اس لیے اس کی تفصیل ابھی غیر ضروری ہے، لیکن بظاہر حسب ذیل نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

(۱) گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معاینہ کر سکے گا، اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی کو پسند کریں گے۔

(۲) جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی ان کو کچھ ماہوار امداد دے گی۔

(۳) کلکتہ میں بہت بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مشرقی درس گاہ قایم ہوگی، مدارس عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اس درس گاہ میں تعلیم حاصل کریں گے۔

(۴) اس درس گاہ کے تعلیم پانے والوں کو بیش قرار وظیفے دیے جائیں گے۔

(۵) اس درس گاہ سے سند لینے کے بعد ان کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی، جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی۔

(۶) مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی اور جس کے تعلیم یافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے، ان کو کالجوں اور اسکولوں کی پروفیسری اور مدرسی مل سکے گی۔

ان واقعات کے بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ جو فرقہ اب تک بغیر کسی معاوضہ کے عربی علوم کی تحصیل میں مشغول تھا، اب کسی قدر ذریعۂ معاش حاصل ہونے کی صورت میں امید ہے کہ اپنا کام زیادہ مستعدی اور زیادہ وسعتِ حوصلہ سے انجام دے، ہم لوگ اگر عربی علوم اور مذہبی علوم کے جان دادہ اور جاں نثار ہیں تو اس قدر معاوضہ ہمارے لیے بالکل کافی ہے اور کوئی غیر گورنمنٹ اس سے زیادہ اور کیا کرسکتی ہے۔

(الندوہ جلد ۸ نمبر ۸ اگست ۱۹۱۱ء)

ریاست حیدرآباد
کی
مشرقی یونیورسٹی

معلوم نہیں مسلمانوں میں کون سی مبارک ساعت میں تقلید کی بنیاد پڑی تھی کہ زمانے کے سیکڑوں ہزاروں انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشیں اب تک کمزور نہیں ہوئیں، تعجب اور سخت تعجب ہے کہ جدید تعلیم یافتہ فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویدار ہے اور درحقیقت جدید تعلیم کا یہی اثر ہونا چاہیے تھا، وہ بھی اسی طرح بے سمجھے بوجھے، ایک عام راستے پر پڑ لیا ہے اور کچھ نظر نہیں آتا کہ ہم کہاں جارہے ہیں، جس تعلیم اور نتائجِ تعلیم کا اس قدر شوروغل ہے، وہ کیا ہے؟ کالجوں کی ڈگریاں اور نوکریاں ودگر ہیچ، شاید کہا جائے کہ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہیں اور اسی لیے تو ہم اپنی خاص یونی ورسٹی چاہتے ہیں کہ اپنی ضرورتوں کے موافق اپنی تعلیم کا سامان بہم پہنچائیں، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر روپیہ بہم نہیں پہنچتا کہ یونی ورسٹی بن سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ جہاں یونی ورسٹی بن سکتی ہے وہاں کیا ہورہا ہے؟ حیدرآباد میں عنانِ تعلیم انھیں لوگوں کے ہاتھ میں رہی ہے جو ہندوستان میں یونی ورسٹی بنانے کے محرک اور جاں دادہ ہیں، یونی ورسٹی کے لیے دس لاکھ روپیہ مانگا جارہا ہے، حیدرآباد میں ایک منٹ میں یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد میں صرف ایک کالج پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہورہا ہے، حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پرواہ نہیں ہوسکتی کہ اگر وہ اپنی یونی ورسٹی بنائے تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیوں کہ حیدرآباد خود ایسی وسیع ریاست

ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں، لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہے کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم کی اصلاح وترمیم ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لیے وہاں دارالعلوم ہے، پنجاب یونی ورسٹی کے مشرقی امتحانات کے بیہودہ نصاب کی آج تک تقلید کی گئی، پنجاب نے مولوی، فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کیے ہیں وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک اسی کی محکومی کی گئی اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا جب تک خود یونی ورسٹی نے یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کر سکتے۔

دوسہ بار باتو گفتم کہ مرا بہ ہیچ بستان   نشد اتفاق شاید کہ بہ این بہا گرانم

بہرحال خوبیِ تقدیر سے پنجاب یونی ورسٹی نے حیدرآباد کے طلبہ کو اپنے امتحانات میں شامل کرنے سے روکا، اب اگر یہ ممکن ہوتا کہ یہ سب طلبہ وہاں کے انگریزی اسکولوں میں داخل ہو جاتے تو پھر اسی تقلید پرستی کے دام میں گرفتار ہو جاتے۔

از دام جستہ باز سوے دام میرود

لیکن سات سو طلبہ جو انگریزی کے ایک حرف سے واقف نہ تھے اور جن میں سے اکثر انگریزی پڑھنا بھی نہیں چاہتے تھے وہ کیوں کر ایک نئی زندگی اختیار کر سکتے تھے، غرض اب یہ خیال ہوا کہ دارالعلوم کا نصاب یہاں کی ضرورتوں کے لحاظ سے خود تیار کیا جائے، نواب عماد الملک بہادر بلگرامی سی. ایس. آئی ممبر انڈیا کونسل اس وقت ناظمِ تعلیمات تھے، انھوں نے سرکار میں یہ تجویز پیش کی اور منظور ہوئی، اس کے بعد نواب صاحب موصوف نے میرے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:

> ''اس وقت باعث تصدیع یہ امر ہوا کہ میں نے اس حادثہ (میرے پاؤں کے زخمی ہونے کی طرف اشارہ ہے) کے چند ہی روز پہلے سرکار میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہمارے دارالعلوم کا

تعلق اب پنجاب یونی ورسٹی سے منقطع ہوگیا ہے، پس مناسب ہوگا کہ ہم اپنے لیے خود ہی مناسب انتظام کریں یعنی عربی و فارسی نصاب تعلیم مرتب کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی جلد مقرر کی جائے جس میں ایک رکن آپ ہوں اور نصابِ تعلیم زمانۂ حال کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب ہوتا کہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پا کر امتحان میں کامیابی حاصل کریں وہ سرکاری خدمات ادا کرنے کے اہل پائے جائیں۔

اس امر کے اطلاع دینے سے میرا یہ منشا نہیں کہ آپ سے فوراً تکلیف گوارا کرنے کی خواہش کروں بلکہ محض اس قدر اطمینان حاصل کرنا منظور ہے کہ کامل صحت کے بعد آیا یہ امر ممکن ہوگا کہ آپ یہاں تشریف لائیں، ایسے قومی کاموں میں آپ ہمیشہ تکلیف گوارا کرتے رہے ہیں، اگر آپ کا تشریف لانا ممکن نہ ہوتو کیا آپ نصابِ تعلیم پنجاب یونی ورسٹی پر نظر غائر ڈال کر ایک جدید نصاب وہیں مرتب فرما سکتے ہیں، ترمیمِ نصاب میں چند ابواب مدنظر رہیں تو بہتر ہے۔

(۱) اصلاح نصاب موجودہ پنجاب یونی ورسٹی بہ لحاظ مقتضائے وقت و زمانہ و ضروریات خدمات حکومتی۔

(۲) تکمیل تحصیل علوم شرقیہ۔

مد دوم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اورینٹل تعلیم ناقص ہے، بہت سے علوم جن سے تکمیل فضیلت کی ہوتی ہے، اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جماعت مولوی فاضل سے بالاتر اقل مرتبہ دو جماعتیں ہوں جن میں تحصیل کی تکمیل ہو سکے، میری رائے ناقص ہے اگرچہ سلسلۂ نظامیہ کی پابندی ضرور نہیں ہے مگر تکمیل تحصیل کے لیے بہت کچھ اضافہ

کتب درسیہ کی ضرورت ہے۔"

نواب صاحب موصوف کا یہ خط اس وقت پہنچا جب مجھ پر پاؤں کے زخمی ہونے کا واقعہ گذر چکا تھا اور میں صاحبِ فراش تھا، جب اس سے صحت ہوئی تو مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری حیدر آباد نے نواب عماد الملک بہادر کی تحریر کی بنا پر مجھ کو پھر طلب کیا اور میں جون ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد گیا، وہاں چند روز رہ کر ایک نصاب تیار کیا اور اس کے متعلق ایک یادداشت لکھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصاب کن اصول پر تیار کیا گیا ہے، یادداشت مذکور کی نقل درج ذیل ہے۔

رپورٹ
متعلق
اصلاحِ نصاب دار العلوم حیدر آباد

بموجب مراسلہ ناظم صاحب سابق نواب عماد الملک بہادر و مراسلہ ناظم صاحب حال مورخہ ۳ ماہ الٰہی ۱۳۱۷ ہجری نشان (۱۲۲۳) دار العلوم کے نصاب اور مدتِ تعلیم میں جو تغیر اور اصلاح میں نے کی ہے اور جس کا نقشہ اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہے، اس کی نسبت میں ایک علاحدہ مفصل یادداشت پیدا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ترمیم اور اصلاح کن اصولوں پر کی گئی اور ترمیم اور اصلاح کی مہماتِ امور کیا ہیں۔

نصابِ دار العلوم کی ترتیب دینے کے وقت سب سے پہلے یہ امر پیش نظر ہونا چاہیے کہ دار العلوم کا اصلی مقصد کیا ہے اور کس قسم کے لوگ اس سے پیدا کرنے مقصود ہیں۔

دار العلوم جب تک پنجاب یونی ورسٹی سے متعلق رہا، اس کی غرض صرف ایسے لوگوں کا پیدا کرنا تھا جو سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے لائق ہوں اور اس مقصد

میں دارالعلوم نمایاں طور پر کامیاب رہا، لیکن اب جبکہ دارالعلوم خود مختار اور آزاد ہوگیا ہے، اس کے مقاصد زیادہ وسیع ہوگئے ہیں، اس کی غرض اب ایسے اشخاص کو پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قابل ہوں بلکہ اس سے ایسے اشخاص بھی پیدا ہوں جو شرعی خدمات انجام دینے کے قابل ہوں، جو علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، ادب میں کمال رکھتے ہوں، جو ملک میں مذہبی عالم کی حیثیت سے تسلیم کیے جاسکتے ہوں اور اس بنا پر ان کی ہدایت اور تلقین کا عامۂ اہل اسلام پر اثر پڑ سکے اور وہ عوام میں عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا سکیں، جو علوم قدیمہ کے ساتھ جدید علوم وفنون اور جدید خیالات سے بھی آشنا ہوں تاکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ پر ان کا اثر پڑ سکے۔

یہ امر بھی خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ اس وقت تک جو تعلیم جدید تمام ہندوستان میں جاری ہے، اس کی نسبت تمام اہل الرائے نے تسلیم کرلیا ہے کہ وہ ہماری ضرورتوں کے لیے کافی نہیں، لیکن چونکہ بغیر اس طریقۂ تعلیم کے سرکاری نوکریاں حاصل نہیں ہوسکتیں اس لیے چارناچار اسی طریقہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس طریقۂ تعلیم میں ہماری مذہبی اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہیں، اس میں نہ مذہبی تعلیم ہے نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہوسکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق اور مسائلِ اخلاق کا علم ہوسکتا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک شخص گو بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرلے، لیکن اسلامی مسائل، اسلامی تاریخ، اسلامی اخلاق کے متعلق اس کی واقفیت اور اس کا پوزیشن اس سے کچھ زیادہ نہیں ہوسکتا جو ایک عامی مسلمان کا ہوسکتا ہے۔

بایں ہمہ ہندوستان میں اس مشکل کا کچھ علاج نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کے لیے موقع ہاتھ آئے۔

لیکن چونکہ ریاست نظام ایک وسیع مملکت ہے اور اس وقت تک اس نے سرکاری نوکریوں کے لیے یونیورسٹی کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے، اس

لیے اس کو موقع ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے علاوہ ایک ایسا خاص سلسلۂ تعلیم بھی قایم کرے جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو اور جس کے تعلیم یافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں، اس قسم کی تعلیم کا انتظام دارالعلوم میں ہوسکتا ہے اور ہم کو موجودہ نصاب کے مرتب کرنے میں اس پہلو کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

اغراض مذکورہ بالا کے لحاظ سے نصاب موجودہ میں جو تغیر اور اضافہ کیا گیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) ہر فن کی تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقے سے بیان کیے گئے ہوں تاکہ طالب العلم بہ آسانی تمام مسائل پر حاوی ہو جائے، اس بنا پر وہ کتابیں جو معما اور چیستاں کے طور پر اس قدر مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں کہ ایک ایک سطر میں ایک ایک صفحے کے مطالب کھپا دیے گئے ہیں وہ خارج کر دی گئیں۔

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں ہیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیے گئے ہیں، اس لیے خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم اس فن کے مسائل سے دور پڑ جاتا ہے، مثلاً ملاحسن، میرزاہد، قاضی مبارک وغیرہ کہ یہ کتابیں دراصل منطق میں ہیں لیکن ان میں فلسفہ اور امور عامہ کے دقیق مسائل اس قدر شامل کرائے ہیں کہ اصل فن کے مسائل پر گویا پردہ پڑ گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ تمام کتابیں پڑھ کر بھی طالب العلم کو خاص منطقی مسائل کی مشق نہیں ہوتی اور یہ نہیں کر سکتا کہ تقریر اور مناظرے میں اپنے دعووں کو اشکال منطقی کے ذریعے سے ثابت کر سکے۔

اس بنا پر نصابِ حال میں ہر فن میں وہی کتابیں رکھی گئی ہیں جن میں خالص اسی فن کے مسائل استیعاب کے ساتھ مذکور ہیں۔

(۳) قدیم نصاب میں قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ نہایت کم ہے، قرآن مجید کا

متن تک درس میں نہیں، تفسیروں میں صرف دو تفسیریں درس میں داخل ہیں، ایک جلالین جس کے الفاظ اور قرآن مجید کے الفاظ عدد میں برابر برابر ہیں اور دوسری بیضاوی جس کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہیں جو کتاب کا پندرھواں حصہ بھی نہیں، اس لیے قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا ہے۔

(۴) قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصہ نہایت کم ہے، حالانکہ ادب کے بغیر تفسیر، حدیث، اصول فقہ کسی چیز میں کمال نہیں حاصل ہوسکتا، اس بنا پر ادب کا نصاب بہت بڑھا دیا گیا ہے۔

(۵) یہ عام شکایت ہے کہ عربی خواں سب کچھ پڑھ جاتے ہیں لیکن چند سطریں صحیح عربی نہیں لکھ سکتے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادب کی تعلیم کم تھی، دوسری یہ کہ انشا پردازی اور مضمون نگاری کی مشق نہیں کرائی جاتی تھی، اس لیے نصابِ حال میں انشا پردازی کے لیے خاص گھنٹے مقرر کیے گئے۔

(۶) عقاید وعلم کلام میں صرف ایک کتاب اور وہ بھی معمولی درجہ کی درس میں تھی یعنی شرح عقاید نسفی، حالانکہ یہ فن تمام اسلامی فنون پر مقدم اور سب کا اصل الاصول ہے، اس لیے اس فن میں متعدد اور بلند پایہ کتابیں نصاب میں رکھی گئیں۔

(۷) تاریخ اسلام اور عام تاریخ کی ایک کتاب بھی نہ تھی، اس لیے اس فن کی کتابیں بھی داخل کی گئیں۔

(۸) علوم جدیدہ کی بعض کتابیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں نصاب میں شامل کی گئیں، لیکن اس موقع پر یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ ان کے پڑھانے کا انتظام مشکل ہے، ہمارے علما ان کتابوں کو پڑھا نہیں سکتے اور انگریزی خواں عربی زبان سے آشنا نہیں، یہ ہوسکتا تھا کہ اردو میں جو کتابیں موجود ہیں، وہ داخلِ نصاب کردی جائیں لیکن جہاں تک مجھ کو معلوم ہے، طبعیات کی جو کتابیں اردو میں موجود ہیں وہ مڈل کے رتبہ سے زیادہ نہیں، اس کے سوا عربی خواں طلبہ اردو زبان کی کتاب کو

وقعت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے، اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ ایسے پروفیسر مقرر کیے جائیں جنھوں نے بی اے میں سائنس لیا ہو اور عربی زبان ان کی سکنڈ لینگوتیج رہی ہو۔

(۹) انگریزی زبان بطور سکنڈ لینگوتیج کے لازمی قرار دی گئی ہے، میں انگریزی زبان سے واقف نہیں ہوں، اس لیے میں نے انگریزی کتابوں کا نام نہیں لکھا ہے، لیکن اس قدر بخوبی جانتا ہوں کہ موجودہ نصاب میں اس قدر گنجایش ہے کہ انگریزی زبان دانی کی کتابیں انٹرنس تک کی اس میں شامل کی جا سکتی ہیں اور درجۂ فاضل کے بعد دو برس اس غرض سے رکھے گئے ہیں کہ جو شخص چاہے دو برس تک صرف انگریزی زباندانی کی تعلیم حاصل کرے جس سے وہ انگریزی زبان پر بخوبی قادر ہو سکتا ہے۔

(۱۰) نصاب سابق میں ابتدا سے اخیر تک مدتِ تعلیم ۱۹ برس تھی لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی، اس لیے گھٹا کر کل مدت ۱۴ برس قرار دی گئی ہے۔

(۱۱) نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی ہے اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ لڑکا ساتویں برس کے سن سے دارالعلوم کی ابتدائی جماعتوں میں لیا جائے گا، یہ تعلیم پانچ برس میں تمام ہوگی اور اس میں اردو اور ابتدائی فارسی اور حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی۔

اس درجہ کے بعد دو الگ شاخیں شروع ہوں گی یعنی منشی اور عالم، اور طالب العلم کو اختیار ہوگا کہ ان دونوں شاخوں میں سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے۔

منشی کے ۳ سال اور منشی عالم کے ۲ سال اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا ہے، منشی فاضل تک طالب العلم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کی سوادخوانی اور انگریزی بقدرِ عام ضرورت آجائے گی۔

عربی کے دو درجے قرار دیے گئے۔

عالم، اس کی مدتِ تعلیم ۸ برس ہے، یہ درجہ بی اے کے برابر ہے، اس میں تمام علوم متداولہ عربی اور بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زباندانی انٹرنس کے درجہ تک

آ جائے گی، یہ میری خاص رائے ہے لیکن اگر یہاں کے حالات کے لحاظ سے ضروری ہوتو بیچ میں ایک اور درجہ مولوی یا ملا کے نام سے قایم کیا جائے اور یہ درجہ پانچویں سال تک تمام ہو جائے، اسکے بعد تین برس عالم کے لیے رکھے جائیں۔

فاضل، اس کی مدتِ تعلیم دو برس ہے اور یہ درجہ ایم اے کے برابر ہے، اس میں کسی ایک خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ وغیرہ

عالم یا فاضل کے درجے کے بعد ضرور ہے کہ چند طلبہ کو دو برس تک خالص انگریزی زبان سکھائی جائے تا کہ انگریزی زبان میں تحریر اور تقریر کا ملکہ ہو اور ایسے علما پیدا ہوں کہ یورپ کی علمی تحقیقات کو اسلامی علوم میں اضافہ کر سکیں اور انگریزی داں جماعت کے مجمع میں انھیں کی زبان اور خیالات میں اسلامی عقاید اور مسائل پر تقریر کر سکیں۔

(۱۲) نصابِ تعلیم کے نقشے کے ملاحظے سے چونکہ ہر فن کی کتابیں یکجائی طور پر پیش نظر نہ ہوں گی، اس لیے اس موقع پر ہر فن کی الگ الگ کتابیں یکجا لکھ دی جاتی ہیں، جس سے بیک نظر اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے گا کہ ہر فن میں کس پایہ کی اور کس قدر کتابیں نصاب میں تجویز کی گئی ہیں۔

ادب و معانی و بیان

اخوان الصفا، اطباق الذہب عبدالمومن اصفہانی، سبعہ معلقہ، مجموع الادب حسن التوسل الی صناعۃ الترسل، مختصر المعانی، متنبی، تمیۃ بن المقفع، مقامات حریری، حماسہ، نقد الشعر ابن قدامہ، نہج البلاغۃ، اسرار البلاغہ عبدالقاہر الجرجانی، کتاب الصناعتین ابو ہلال عسکری۔

فقہ و اصول فقہ

قدوری، سراجی، درمختار، ارکان اربعہ مولانا بحر العلوم، ہدایہ، نور الانوار،

تحریر ابن الہمام، مسلم الثبوت، توضیح وتلویح، رسالۂ امام شافعی۔

قرآن مجید وتفسیر

الہدایہ الی الصراط المستقیم، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، جلالین، بیضاوی، احکام القرآن ابوبکر رازی۔

فلسفہ

ہدیہ سعیدیہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ از خیرآبادی، شرح اشارات رازی وطوسی، شرح حکمۃ الاشراق، شمس بازغہ، دروس الاولیہ فی العلوم الجدیدہ، ہیأت جدیدہ۔

کلام واسرار الدین

رسالہ التوحید، معالم امام رازی، حجۃ اللہ البالغہ۔

اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی قرار پائی، جس کا اجلاس شعبان ۱۳۲۶ھ میں قرار پایا لیکن چونکہ عین اسی زمانہ میں ندوہ کی خاص ضرورت سے مجھ کو لکھنؤ واپس آنا پڑا، اس لیے وہ اجلاس ملتوی ہوگیا، اس کے بعد میں ۲۳ر جنوری ۱۹۰۹ء کو پھر حیدرآباد آگیا اور ایک کمیٹی میں نصاب مرتبہ پیش کیا گیا، اس کمیٹی میں مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت وافسر تعلیمات شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی، مولوی انوار اللہ صاحب استاد حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبدالحلیم صاحب شرر مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، لیکن چونکہ اس کمیٹی میں کچھ مراتب باقی رہ گئے تھے، اس لیے ۱۷ر فروری ۱۹۰۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا جس کے پریسیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت تھے اور جس میں نواب عماد الملک بہادر اور ڈاکٹر سید سراج الحسن ناظم تعلیمات بھی ہ

حیثیت رکن کے شریک تھے۔

دونوں کمیٹیوں میں آزادی سے ہر پہلو پر بحث ہوئی اور کسی قدر تغیر اور ترمیم کے ساتھ نصابِ مرتبہ منظور کیا گیا۔

نواب عماد الملک بہادر کی رائے تھی کہ علوم عربیہ کے ساتھ انگریزی کی تعلیم نہیں ہوسکتی، اس لیے اس کو نصاب سے خارج کر دینا چاہیے، لیکن یہ جب ظاہر کیا گیا کہ علوم عربیہ میں بہت سی فضول کتابیں جو منطق وفلسفہ کی شامل تھیں خارج کر دی گئی ہیں، اس لیے کافی گنجایش ہوسکتی ہے تو نواب صاحب موصوف نے بھی اتفاق ظاہر کیا۔

ہم کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا کہ اس کمیٹی میں نہایت متقشف اور پرانے خیال کے علما بھی شریک تھے تاہم انگریزی کے داخل کرنے سے کسی نے انکار نہیں کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں ہندوستان کی بہ نسبت روشن خیالی کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

نصاب کے طے پانے کے بعد اسی کے موافق دارالعلوم میں جدید اسٹاف قایم ہوگا، اس کے ساتھ ایک مجلس بطور سینٹ کے قایم ہوگی اور اسی کے لیے فیلوز منتخب ہوں گے، اس طرح ایک مشرقی یونی ورسٹی کی بنیاد قایم ہو جائے گی۔

نہایت مسرت کی بات ہے کہ اس وقت افسرانِ تعلیم، نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت اور مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت اور سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات ہیں، اس لیے ہر طرح پر امید ہے کہ یونیورسٹی عمدہ اور مستحکم اصول پر قایم ہوگی۔

یہ ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔

درکفے جامِ شریعت، درکفے سندانِ عشق　　　هر هوسناکے نداند جام و سندان باختن

(الندوہ ج ۶ نمبر ۲ مارچ ۱۹۱۹ء)

احیاءِ علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل

ضبط کروں میں کب تک آہ! چل رے خامہ بسم اللہ

جدید تعلیم کے فرزندانِ رشید میں سے ایک صاحب نے جو اپنے آپ کو ''ریڈیکل'' کہتے ہیں، علی گڈھ منتھلی میں ایک مضمون ''احیاءِ علوم عربیہ'' کے عنوان سے لکھا ہے، مضمون کا شانِ نزول وہ تحریک ہے جس کا منشا یہ ہے کہ علی گڈھ میں علوم عربیہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، یہ تحریک ایک انگریزی پروفیسر کی طرف سے پیش ہوئی تھی، جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ خود گورنمنٹ کے ایما کا بھی اس میں شائبہ تھا۔

ہمارے قومی لیڈروں نے نہایت دلیری، نہایت آزادی، نہایت استقلال سے اس تجویز کی مخالفت کی اور دنیا پر ثابت کردیا کہ ایسے ضروری موقع پر جب کہ احتمال تھا کہ مسلمانوں کی قوم اس تجویز سے دفعۃً برباد نہ ہوجائے، نکتہ چینوں کو یہ اعتراض واپس لینا پڑے گا کہ ہمارے لیڈر کسی انگریز افسر کی تحریک کی مخالفت نہیں کرسکتے۔

لیکن اس وقت تک مخالفت کی جو وجہ ارکانِ کالج یعنی نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے پرزور آرٹکلوں میں ظاہر کی وہ صرف یہ تھی کہ ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لیے بھی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دی جائے۔

اگرچہ یہ امر کچھ کم تعجب انگیز نہ تھا کہ ایسا کالج جس کے نام کے ساتھ اورینٹل کا لفظ شامل ہے جو ہمیشہ تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کی قومی

اور مذہبی تعلیم کے مرکز ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، جو اپنے مہمات کو ایران تک وسیع کر کے وہاں کے لوگوں کو اپنے دائرۂ اثر میں لانا چاہتا ہے، جس کی مجوزہ یونی ورسٹی کی ایک بڑی خصوصیت علوم مذہبی کا احیاء ہے، عربی تعلیم کی طرف سے صریح ایسی بے اعتنائی کا اعلان کرے، کیوں کہ یہ بالکل ممکن تھا کہ انگریزی تعلیم کو بغیر کسی قسم کے نقصان پہنچانے کے عربی تعلیم کا بھی بقدر ضرورت انتظام کیا جاتا، تاہم ان بزرگوں نے نفس علوم عربیہ پر کوئی حملہ نہیں کیا تھا، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ علوم عربیہ کے بڑھنے سے (جیسا کہ ریڈیکل صاحب نے بیان کیا ہے) طبیعت میں آزادی اور دلیری نہیں پیدا ہوتی اور بزرگان ممدوح علوم عربیہ ہی کے تعلیم یافتہ ہیں۔

لیکن ریڈیکل صاحب تعلیم جدید کے یادگار ہیں، اس لیے وہ نہایت آزادی اور دلیری سے آگے بڑھے اور اصل راز کا پردہ اٹھا دیا یعنی یہ کہ علوم عربیہ خود اس قابل نہیں کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے، ان کے مقتبس فقرے بعینہٖ حسب ذیل ہیں:

> ''بہر صورت ہمیں اس رائے سے بالکل اختلاف ہے کہ عربی میں ایسے علوم موجود ہیں جن کی تعلیم ہمارے دماغوں میں روشنی، دلوں میں صفائی، خیالات میں پاکیزگی، ارادوں میں بلندی اور طبیعتوں میں استقلال پیدا کرے گی۔
>
> ہم جہاں تک سمجھتے ہیں عرب ہمیشہ ایک نہایت جاہل اور وحشی قوم رہے ہیں، شائستگی اور تہذیب سے ان کو بہت کم حصہ ملا ہے، لہٰذا ان کی زبان میں علوم وفنون کے کسی عمدہ ذخیرہ کا موجود ہونا بعید از قیاس ہے۔'' (صدقنا وآمنا)
>
> ایسی حالت میں جبکہ رسول کا نواسہ تشنہ لب کربلا میں شہید کیا جائے، صحابہؓ کی داڑھیاں نوچی جائیں اور مسجد نبوی میں گھوڑے کی لید ڈالی جائے، علوم وفنون کی کیا خاک اشاعت وتدوین ہو سکتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت کا کل نظم کا ذخیرہ عربوں کی خانہ جنگیوں اور خوں ریزیوں کے قصص یا اونٹنی کی لمبی اور کھجور کی خاردار شاخ کی تعریف اور توصیف سے پر ہے، کسی قسم کے علمی مضامین کا اس میں پتہ نہیں۔

پچھلے زمانہ کے کلام میں سوائے عیش پرست خلفا اور ان کے مہ جبیں معشوقوں کی تعریف اور شراب و کباب کی توصیف کے کیا رکھا ہے؟ ایسی گندہ اور بے کار نظم کو پڑھنے سے بجز تخریبِ اخلاق کے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔؟

کہا جاتا ہے کہ فن تاریخ میں عربوں نے بہت ترقی کی تھی، وہ تاریخیں پیشتر تو عمدہ دیباچوں اور حواشی کے اضافہ کے ساتھ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہو گئی ہیں، ان کا مطالعہ اصل عربی کتابوں سے بہت زیادہ مفید ہے۔''

(یہاں تک ریڈیکل صاحب کے فقروں کا اقتباس تھا)

سب سے پہلے قابل لحاظ یہ امر ہے کہ احیاءِ علوم عربی کے مسئلہ پر ریڈیکل صاحب کو اس پہلو سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت بھی تھی یا نہیں؟

ہم ریڈیکل صاحب اور تمام مخالفینِ عربی سے پوچھتے ہیں کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے بفرضِ محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عربی میں قابلِ قدر ذخیرۂ علمی موجود ہے تو وہ کیا عربی تعلیم کو جائز رکھیں گے؟ مسٹر ماریسن نے عربی کے ساتھ ساتھ جدید سائنس کی تعلیم کی اسکیم بھی پیش کی تھی، کیا مخالفینِ عربی نے اس اسکیم کی تائید کی؟ کیا سائنس بھی عربی کی طرح قابل التفات نہیں ہے؟ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کیا جدید گروہ علم کو علم کے لیے پڑھتا ہے، کیا اگر انگلش تعلیم سرکاری ملازمت کا ذریعہ نہ رہے تو ایک شخص بھی کسی کالج کے احاطہ میں نظر آئے گا؟ کیا کالج سے نکلنے کے بعد بھی انگریزی کے

ذ خائرِ علمی کو اس گروہ کے دربار میں باریابی کی عزت ملتی ہے؟

جب یہ حالت ہے تو احیاءِ عربی کی تجویز سے انکار کے لیے صرف یہ وجوہ کافی تھے کہ ہماری زندگی اور ہماری تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت اور نوکری ہے اور یہ عربی علوم سے حاصل نہیں ہوسکتی، یہ بالکل بجا استدلال تھا، جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا تھا۔

ریڈیکل صاحب کی غرض اگر بالذات علوم عربیہ کی تنقیص اور تحقیر تھی تو اس کے لیے مستقل عنوان اختیار کرنا تھا، احیاء علوم عربیہ کے مسئلہ سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا۔

شاید ریڈیکل صاحب کو یہ خیال ہو کہ اگر علوم عربی کی فضیلت ثابت ہوگی تو ممکن ہے کہ کچھ طلبہ اس طرف بھی متوجہ ہو جائیں، لیکن ہم ان کو پورا اطمینان دلاتے ہیں کہ جدید گروہ ایک عاقبت اندیش اور عملی گروہ ہے، اس نے اپنا راستہ متعین کرلیا ہے اور وہ ہرگز اس فریب میں نہیں آسکتا کہ علم کو علم کے لیے سیکھنا چاہیے۔

اب ہم ریڈیکل صاحب کے ان جملوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو انھوں نے علوم عربی کی نسبت ارشاد فرمائے ہیں، لیکن ہم حیران ہیں کہ ان کے مقابلہ میں طریقۂ استدلال کیا ہوگا، یورپ کے اہلِ فن جو زبان عربی سے ماہر ہونے کی وجہ سے اس مسئلہ کے فیصلہ کرنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں مثلاً پروفیسر سیدیو، پروفیسر لیبان، پروفیسر رینان، پروفیسر مونک (فرنچ کے مشہور مصنف ہیں)، پروفیسر براؤن ہنری لوئیس، پروفیسر زخاؤ (جرمن کا مشہور عربی داں فاضل ہے) وغیرہ وغیرہ، ان کی نسبت ریڈیکل صاحب کو بدگمانی ہے کہ وہ قصداً مسلمانوں کو نشۂ غفلت میں مخمور رکھنے کے لیے مداح ہیں۔

ہم خود اگر مسلمانوں کے علمی کمالات اور ایجادات کی مثالیں پیش کریں تو مشکل یہ ہے کہ ریڈیکل صاحب عربی نہیں جانتے اور تاریخ دانی کا یہ حال ہے کہ

فرماتے ہیں کہ ''خلیفہ اول و دوم کے وقت تک قرآن مجید بھی مرتب نہیں ہوا تھا''!!

ریڈیکل صاحب کے استدلال کا سنگِ بنیاد یہ ہے کہ ''عرب ایک وحشی قوم ہے، اس لیے ان کی زبان میں عربی ذخیرہ کا ہونا بعید از قیاس ہے''، لیکن اگر عرب کا وحشی ہونا تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے اس دعویٰ کو کچھ مدد نہیں پہنچتی، عربی زبان میں جن لوگوں نے علمی ذخیرے مہیا کیے وہ عجمی تھے، مثلاً فارابی، بوعلی سینا، رازی، غزالی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی وغیرہ اور عجم کو غالباً ریڈیکل صاحب بھی وحشی کا خطاب دینا پسند نہیں کرتے۔

پروفیسر رینان نے جو اسلام کے ساتھ تعصب رکھنے میں مشہور ہیں، فرانس کے اکاڈیمی میں ایک لکچر دیا تھا جس کا موضوع یہ تھا کہ ''اسلام اور علم دونوں جمع نہیں ہوسکتے''۔

اس لکچر میں جہاں مجبوراً اس کو مسلمانوں کی علمی اور فلسفی تحقیقات کا ذکر کرنا پڑا، اس نے یہ کہا ''ہاں فلسفہ عربی زبان میں ہے لیکن عربوں میں نہیں ہے۔''

رینان نے اگرچہ اہلِ عرب کے فلسفہ دانی سے انکار کیا لیکن اس سے انکار نہ کرسکا کہ عربی زبان فلسفہ کا مخزن ہے، لیکن ریڈیکل صاحب یہ بھی گوارا نہیں کرسکتے کہ عربی میں علوم وفنون کا ذخیرہ موجود ہو۔

''ریڈیکل'' صاحب فرماتے ہیں کہ ''لٹریچر میں عربوں کے پاس نثر میں تو کوئی عمدہ ذخیرہ نہیں اور نظم کی یہ کیفیت ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی نظم اونٹنی کی لمبی گردن اور زمانۂ اسلام کے مہ جبیں معشوقوں کی توصیف پر محدود ہے''، یہ بالکل اسی قسم کی بات ہے کہ پرانے مولوی یورپ کے علوم وفنون کی نسبت کہتے ہیں کہ ''یہ لوگ بجز اس کے لوہاروں اور نجاروں کی طرح کچھ کلیں بنالیں یا جراحوں کی طرح کچھ چیر پھاڑ لیں اور کیا جانتے ہیں۔''

افسوس!

از رد و ہم قبولِ تو فارغ نشستہ ایم　　اے آنکہ خوبِ ما نہ شناسی ز زشتِ ما

عرب کے فلسفہ اور علوم وفنون کی تحقیر کا تو کوئی ضعیف پہلو نکل بھی سکتا تھا لیکن عرب کی فصاحت و بلاغت، شاعری اور زبان آوری سے انکار کرنا آفتاب کی روشنی سے انکار کرنا ہے، شاعری کی جو اصل حقیقت ہے یعنی مناظر قدرت اور جذباتِ انسانی کو اس طرح ادا کرنا کہ دلوں پر اصلی حالت کا اثر چھا جائے، صرف عرب کی شاعری میں پائی جاتی ہے، عرب کا ایک ایک بدوی یہ قدرت رکھتا تھا کہ اپنے زورِ کلام سے جم غفیر کو جس ارادہ سے چاہتا تھا روک لیتا تھا اور جدھر چاہتا تھا جھونک دیتا تھا، خلفائے بنو امیہ دمشق میں نہایت جاہ وجلال سے سلطنت کرتے تھے، لیکن اپنے بچوں کو صرف اس لیے عرب کے صحرا میں بھیج دیتے تھے کہ بدوؤں میں رہ کر ان کو قوتِ تقریر اور زبان آوری کا ملکہ حاصل ہو جائے، عرب کا ایک ایک شعر قوم کی قوم میں جوش پیدا کر دیتا تھا، آج گلیڈ اسٹون اور برک کی اسپیچیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو عمرو بن کلثوم کے ایک قصیدہ نے قبیلہ تغلب میں سیکڑوں برس تک شرافت اور نوبلٹی کا جوہر قایم رکھا، چنانچہ یہ قصیدہ اس قبیلہ کے ایک ایک بچہ کو یاد کرایا جاتا تھا اس قصیدہ کا ایک شعر یہ تھا۔

اذا بلغ الفطام لنا صبی　　تخر له الجبابر ساجدینا

جس دن ہمارے خاندان کا بچہ دودھ چھوڑ دیتا ہے۔　　تو بڑے بڑے جبار اس کے سجدہ کرنے کو گر پڑتے ہیں۔

عرب ہی کو شاعری میں یہ فخر حاصل تھا کہ وہ جو کہتے تھے سچ کہتے تھے عرب ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ کسی کی مدح کرنا عار اور ننگ سمجھا جاتا تھا اور جب اخیر زمانۂ جاہلیت میں مدح کی ابتدا ہوئی تو یہ التزام تھا کہ سچی اور واقعی باتوں کے سوا اور کچھ نہیں کہتے تھے، ایک بادشاہ نے جب ایک شاعر سے کہا کہ میری مدح کرو تو اس نے صاف کہا کہ ''افعل حتی اقول''، یعنی پہلے تم کچھ کر دکھاؤ تو میں کہوں، زہیر بن ابی سلمٰی کو جب ہرم بن سنان نے ایک قصیدہ پر صلہ دیا تو اس نے معمول کر لیا کہ جب دربار میں آتا تھا

تو کہتا تھا کہ ''میں سب کوسلام کرتا ہوں بہ استثنا ہرم بن سنان کے''یعنی بادشاہ کوسلام کرنا بھی ایک قسم کی خوشامد ہے، جوعرب کے شاعرکوزیبانہیں۔

افسوس ہے کہ ریڈیکل صاحب اور اکثر ان کے ہم فن عربی زبان نہیں جانتے، ورنہ ہم ان کوعربی زبان میں شاعری کے تمام انواع کے ایسے اعلیٰ درجہ کے نمونے دکھاتے جس کی نظیر ان کو بہت مشکل سے مل سکتی، مناظرِ قدرت مثلاً سبزہ زار کوہستان، دریا، جنگل، گرمی کی شدت، جاڑوں کی ٹھنڈ، ابروباراں وغیرہ یا جذباتِ انسانی مثلاً رنج وغم، غیظ وغضب، فخر وجوش، شجاعت ودلیری، ذوق ومحبت وغیرہ کوجس خوبی سے عرب نے ادا کیا ایشیا میں کون قوم اس کی مثال پیش کرسکتی ہے؟

اخلاق کے متعلق ہم دو چار مثالیں صرف ایک کتاب (حماسہ) سے سرسری طور پر انتخاب کرکے پیش کرتے ہیں، اگر ریڈیکل صاحب کے نزدیک یہ شاعری کا عمدہ نمونہ ہوتو ہم اس قسم کے اشعار کا دریا بہادینے کوموجود ہیں۔(۱)

اذا ما اتت من صاحب لک زلة — فکن انت محتالاً لزلته عذرا

وللکف عن شتم اللئیم تکرما — اضرّ له من شتمه حین یشتم

ان من الحلم ذلا انت عارفه — والحلم عن قدرة فضل من الکرم

---

(۱) چونکہ ہمارے دوست مسٹر ریڈیکل زبان عربی سے نابلد ہیں لہٰذا ان کی آسانی کی غرض سے ان اشعار کا ترجمہ نمبروار درج ذیل کیا جاتا ہے لیکن ہمیں ڈر ہے کہ چونکہ ان اشعار میں کھجور کی خاردار شاخ اور اونٹنی کی لمبی گردن کی طرف اشارہ نہیں ہے اس لیے کہیں وہ یہ دعویٰ نہ کربیٹھیں کہ ترجمہ غلط ہے۔

(۱) اگرتمہارے دوست سے کوئی خطا ہوجائے توتم کوخوداس کی طرف سے کوئی عذر گڑھ لینا چاہیے

(۲) ذلیل آدمی کے برا کہنے سے بازرہنا اس کوگالی دینے سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔

(۳) بعض موقع پر بردباری ذلت ہے، لیکن قدرت کے ہوتے بردباری کرنا شرافت ہے۔

لهم جل مالی ان تتابع لی غنی — وان قلّ مالی لم اکلفهم رفدا
وانی لعبد الضیف مادام نازلاً — وما شیمة لی غیرها تشبه العبدا
انا لنرخص یوم الروع انفسنا — ولو نسام بها فی الأمن اغلینا
انی لمن معشر افنی اوائلهم — قولُ الکماة الا این المحامونا
لوکان فی الألف منا واحد فدعوا — من فارس؟ خالهم أیاه یعنونا
اذ الکماة تنحوا، ان یصیبهم — حد الظباةِ وصلناها بأیدینا
اذا المرء لم یدنس من اللوم عرضه — فکل رداءٍ یرتدیه جمیل
تعیرنا انا قلیل عدیدنا — فقلت لها ان الکرام قلیل
تسیل علی حد الظبات نفوسنا — ولیست علی غیر الظبات تسیل
اذا سید منا خلا قام سید — قوول لما قال الکرام فعول
معودة ان لا تسلّ نصالها — فتغمد حتی یستباح قبیل

---

(۱) میرا مال میرے بھائیوں کا مال ہے اور اگر میں غریب ہو جاؤں تو میں ان کو تکلیف نہ دوں گا۔
(۲) میں مہمان کا غلام ہوں لیکن اس معاملہ کے سوا مجھ میں غلامی کی کوئی ادا نہیں۔
(۳) ہم لڑائی کے دن اپنی جانیں ارزاں کر دیتے ہیں لیکن امن کی حالت میں ہماری جانوں کی قیمت بہت گراں ہے۔ (۴) میں اس قبیلہ کا آدمی ہوں جن کے اسلاف کو اس آواز نے فنا کر دیا کہ ’آج کون پناہ دینے والا ہے‘ (۵) اگر ہمارے قبیلہ کا ایک آدمی ہزاروں کے مجمع میں ہو اور کوئی شخص پکارے کہ شہ سوار کون ہے؟ تو ہمارے قبیلہ کا آدمی سمجھ جائے گا کہ میری ہی طرف اشارہ ہے۔ (۶) جب بہادر لوگ تلورا کی دھار سے کترا جاتے ہیں تو ہم بڑھ کر تلوار کو ان تک پہنچا دیتے ہیں۔ (۷) اگر آدمی دناءت سے اپنی آبرو میں داغ نہ لگائے تو جو لباس وہ پہنے گا اس کو زیب دے گا۔ (۸) وہ ہم کو عیب لگاتی ہے کہ ہمارے آدمی کم ہیں، میں نے اس سے کہا کہ ’شرفا تھوڑے ہی ہوتے ہیں۔ (۹) ہماری جان تلواروں کے دھار پر بہتی ہے، لیکن اور کسی چیز پر نہیں بہتی۔ (۱۰) ہم میں کا جب ایک سردار اٹھ جاتا ہے تو دوسرا پیدا ہوتا ہے جو وہی کہتا ہے اور کرتا ہے جو اور سرداروں نے کہا تھا اور کیا تھا۔ (۱۱) ہماری تلواروں کو عادت ہے کہ جب میان سے باہر آئیں تو جب تک ایک قبیلہ برباد نہ ہو جائے وہ میان میں نہیں آتیں۔

ریڈیکل صاحب فرماتے ہیں کہ عربی تاریخیں مفید حواشی کے ساتھ یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہوگئیں ہیں ان کا مطالعہ اصل عربی کتابوں سے زیادہ مفید ہے۔

ہم ''ریڈیکل'' صاحب سے پوچھتے ہیں کہ یورپ کی زبانوں سے کیا مراد ہے؟ اگر انگریزی مراد ہے تو مدعی سست..... کی مثال ہے، تمام انگریزی مصنفین تسلیم کرتے ہیں کہ عربی زبان کا سرمایہ انگریزی میں بہت کم ہے، دو چار معمولی اور متداول کتابوں کے سوا انگریزی میں اس قسم کے تراجم بالکل ناپید ہیں، ہم ایک نقشہ درج کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ یورپ کی زبانوں میں عربی تاریخ کی کس قدر کتابیں ترجمہ ہوچکی ہیں اور ان میں انگریزی کا کس قدر حصہ ہے۔

نمبر	نام کتاب	کس زبان میں ترجمہ ہوا	سنہ ومقام طبع
۱	تاریخ حمزہ اصفہانی	لاطینی	لیپرگ ۱۸۴۰ء
۲	مسعودی	فرنچ	پیرس ۱۸۷۷ء
۳	ابوالفداء	لاطینی	کانھکن ۱۸۹۴ء
۴	تاریخ الدول الاسلامیہ	،،	البسلا ۱۸۴۶ء
۵	رسالہ افادۃ والاعتبار	فرنچ	پیرس ۱۸۱۰ء
۶	سیرۃ سلطان صلاح الدین	لاطینی	لیڈن ۱۸۵۵ء
۷	تاریخ ابن خلکان	انگریزی	
۸	کتاب الاعتبار لاسامۃ بن منقذ	فرنچ	
۹	تاریخ کلبی	جرمن	ڈسٹین فیلڈ ۱۸۵۷ء

مختصر الدول اور تاریخ المکین وابن البطریق کا ترجمہ بھی یورپ کی زبانوں میں ہوگیا ہے، لیکن ان کتابوں کے مصنف عیسائی تھے، اس لیے ہم ان کتابوں کو عرب مورخین کے تصنیفات میں شمار نہیں کرتے۔

اس نقشہ سے واضح ہوا ہوگا کہ ایک دو کتابوں کے سوا باقی کا ترجمہ انگریزی میں نہیں ہوا بلکہ لاطینی وغیرہ میں ہوا ہے، ان سے متمتع ہونے کا طریقہ ریڈیکل صاحب کیا قرار دیتے ہیں؟ کیا وہ اس بات پر راضی ہیں کہ علی گڈھ کالج میں لاطینی اور فرنچ وغیرہ کی تعلیم کی شاخ کھول لی جائے؟ اگر ان کا ایسا ارادہ ہو تو ہم خوشی سے عربی تعلیم کی تحریک کو واپس لیتے ہیں۔

لیکن اصلی سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا کتابوں کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عربی تاریخ کا سرمایہ یورپ کی زبانوں میں منتقل ہوگیا ہے، عربی کی نایاب اور غیر مطبوعہ تاریخیں تو ایک طرف مشہور متداول کتابوں کا بھی ترجمہ نہیں ہوا، ابن خلدون، ابن اثیر، طبری کو بچہ بچہ جانتا ہے، ان کا ترجمہ کس زبان میں ہوا؟ اور کیا ان کتابوں کے ترجمہ کے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یورپین زبانوں میں عربی کا سرمایہ منتقل ہوگیا ہے، کشف الظنون میں جس قدر عربی تاریخوں کے نام مذکور ہیں ان کی تعداد تیرہ سو ہے، کیا اس خزانہ میں سے پان سات تاریخی کتابوں کے ترجمہ کی بنا پر عربی سے بے نیازی کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے؟

عربی تاریخ کا جو اصلی خزانہ ہے یعنی محدثین کی تصنیفات، اس تک ابھی یورپ کی نگاہ ہی نہیں پہنچی، ''تا بہ ترجمہ چہ رسد'' رجال و تراجم کی سیکڑوں ہزاروں کتابوں میں سے کس کتاب کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے؟

یورپ میں عربی تاریخ کی کتابیں نہایت کثرت سے شایع ہوئی ہیں لیکن ترجمہ نہیں بلکہ یورپ نے ان کو اصل زبان ہی میں پڑھنا پسند کیا اور ریڈیکل صاحب کی اس رائے پر عمل نہیں کیا کہ ترجموں کے ذریعہ سے ان پر نظر ڈالنی چاہیے۔

ریڈیکل صاحب فرماتے ہیں کہ ''عربی زبان میں ایسے معلومات نہیں جن سے ارادوں میں بلندی اور طبائع میں استقلال پیدا ہو۔''

آزادی اور استقلال زیادہ تر تاریخی معلومات کا خاصہ ہے، جب ہم کسی

ملک کی تاریخ میں آزادی اور استقلال کی مثالیں پڑھتے ہیں تو طبیعت میں خود بخود ان جذبات کی تحریک ہوتی ہے، عرب کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے لبریز ہے، آزادی عرب کا مایۂ خمیر ہے، بلند خیالی، دلیری، آزادی، حوصلہ مندی کی جو مثالیں تاریخِ عرب کے ہر صفحہ میں ملتی ہیں آج بھی یورپ اس قسم کے واقعات پیش نہیں کرسکتا۔

آزادی کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہوگی کہ صحابہؓ جس قدر آنحضرت ﷺ کا ادب واحترام کرتے تھے، اس سے زیادہ امکان میں نہ تھا، تاہم ہر موقع پر اس آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے کہ آج ہم کو ان کے بیان کرنے میں تامل ہوتا ہے، ہند (امیر معاویہ کی ماں) جب اسلام قبول کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ نے اس سے بیعت لینے کے وقت یہ فرمایا کہ ''عہد کرو کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کروگی'' تو اس نے یہ الفاظ کہے ''**یامحمد انا ربیناهم صغیراً وقتلتهم کبیراً یوم بدر فانت و هم اعلم**'' ''اے محمدؐ! ہم نے تو اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا اور تم نے بدر کی لڑائی میں ان کو قتل کردیا تو تم اور وہ سمجھ لو۔''

حضرت عمرؓ کا رعب وجلال دنیا کو معلوم ہے، لیکن ایک عام عرب سردربار ان سے اس طرح خطاب کرتا تھا کہ کوئی شخص اپنے برابر والے کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا، خالد سیف اللہ نے روم کی غارت میں فخریہ اظہار کیا تھا کہ ہم نے جس کو بادشاہ بنا رکھا ہے (یعنی حضرت عمر فاروقؓ) وہ کسی بات میں ہم سے ترجیح کا برتاؤ نہیں کرسکتا، وہ اگر غلط بولے تو ہم کو اس کو ٹوک دیں، چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالیں، خلاف انصاف کرے تو معزول کردیں۔

امیر معاویہؓ کے حکم سے جب ان کے عامل نے مدینہ منورہ کی مسجد میں یزید کی خلافت کا اعلان کیا اور یہ کہا کہ **سنة ابی بکر و عمر** یعنی جانشینِ سلطنت کرنا ابوبکرؓ وعمرؓ کا طریقہ ہے تو وہیں ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا **کذبت لا بل سنة کسری و قیصر** تو جھوٹ بولتا ہے، یہ کسریٰ اور قیصر کا طریقہ ہے۔

اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں واقعات ہیں، کیا ان مثالوں سے آزادی اور استقلال کے جذبات کو تحریک نہیں ہوتی؟

حقیقت یہ ہے کہ جو گروہ علم کو صرف نوکری کی غرض سے پڑھتا ہے، جس نے معاش کے سیکڑوں اسباب (تجارت، حرفت، صنعت) میں سے صرف نوکری پر قناعت کر لی ہے، جو یورپین علوم وفنون میں سے بجز چند سطحی باتوں کے کچھ نہیں جانتا، جس کو ذوق علمی سے کچھ مس نہیں، جس نے اعلیٰ تعلیم کے لفظ کو بالکل بے جا استعمال کیا ہے، اس کو اس بحث میں پڑنے سے کیا فائدہ کہ عربی زبان میں علوم وفنون ہیں یا نہیں، اگر علوم وفنون ہوتے بھی تو اس گروہ کے کس کام کے تھے، ارکانِ کالج سے ایک بڑا نکتہ جو فرو گذاشت ہوا اور ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ موجودہ طریقہ سے وہ صرف ان لوگوں کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے اور کر سکتے ہیں جن کو معاش کی ضرورت نے انگریزی تعلیم پر مجبور کر رکھا ہے اور امرا اور رؤسا جن کو معاش کی فکر نہیں وہ انگریزی کے واسطے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، لیکن اگر انگریزی تعلیم کے ساتھ پورے طور سے عربی اور مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست ہوتا تو علی گڈھ کالج کے احاطہ میں تعلقہ دارانِ اودھ اور اہالیانِ ملک کے خاندان کی یادگار بھی نظر آتیں۔

خاتمۂ سخن میں یہ کہنا ضرور ہے کہ میری ہرگز یہ رائے نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹا کر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے، ایسا کرنا بے شبہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے، لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علوم عربیہ کی تحقیر، ارکانِ کالج کا اس قسم کے فقرے استعمال کرنا کہ 'ہم سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے، ہم عربی تعلیم پر ایک حبہ بھی صرف کریں گے' نہایت ظلم اور ناانصافی ہے اور اس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کے دل میں کیا جذبات پوشیدہ ہیں؟

یہ کہنا کہ عربی زبان ہماری مذہبی زبان نہیں ہے اور ہے تو صرف قرآن پڑھ لینا کافی ہے، ایک عامیانہ فریب دہی بلکہ بے ہودہ ڈپلومیسی ہے، صاف کہنا چاہیے کہ

ہم کو قرآن کی بھی ضرورت نہیں، یا یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ قرآن کا سمجھنا بغیر عربی کی اعلیٰ تعلیم کے ممکن نہیں۔

بہر حال عربی کی مخالفت جس طریقہ سے کی گئی وہ جس حد تک صحیح بھی ہو لیکن اس کی نسبت یہ مصرع صادق آتا ہے۔

کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بری طرح

عربی کی تحقیر نے ثابت کر دیا کہ قوم واقعی ذلت کے اخیر درجہ پر پہنچ گئی ہے، کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی، جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے اور یہ درجہ اب قوم نے حاصل کر لیا۔

(دکن ریویو مئی ۱۹۰۴ء)



Maqalat-e-
SHIBLI

Vol. III

Maulana Shibli Nomani

Darul Musannefin Shibli Academy
Azamgarh (U.P.) INDIA

ISBN : 978-93-80104-14-0